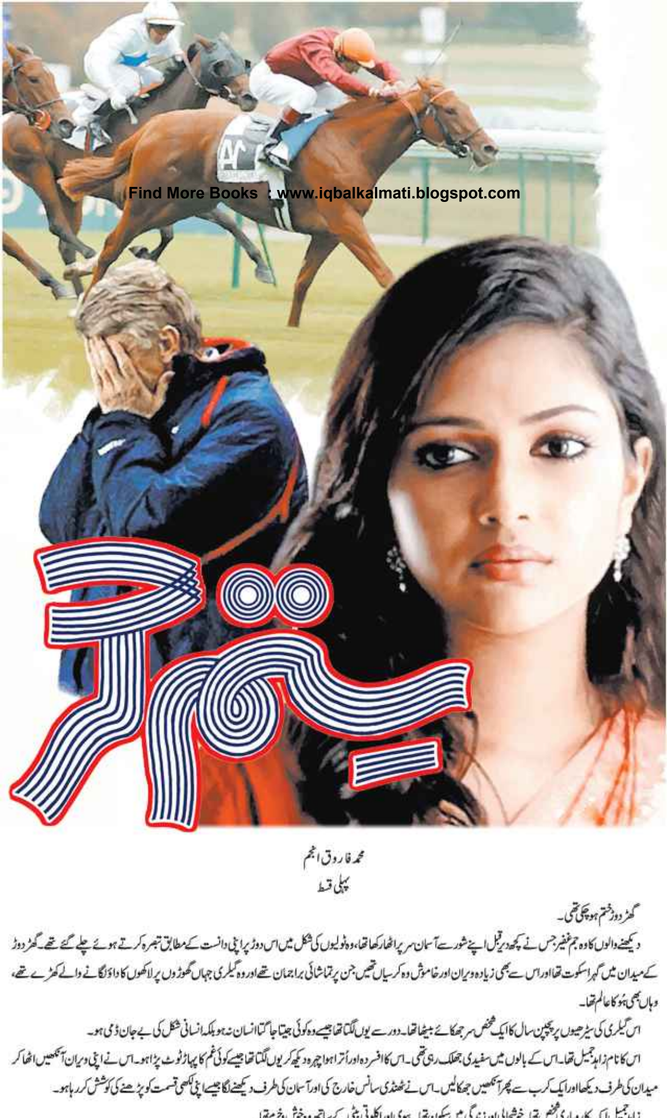

زاہد جمیل جو سب کچھ ہارنے کے بعد گھر آیا تھا،اس کا غصہ اس کے اندر ابل رہا تھا۔وہ پیچھے سے چلایا۔"کہاں جا رہی ہو تم؟"

ردا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔"اپنے کمرے میں۔"

"مجھے ایک کپ چائے چاہئے۔"زاہد نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

ردا نے رک کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر زیر لب کچھ کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

زاہد جمیل صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ہاری ہوئی رقم اور اپنی بربادی اسے چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔گھر میں بیٹھ کر چائے پینے کی بجائے نئے داؤ کے لئے کچھ رقم کا بندوبست کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز لہجے میں بولا۔"رہنے دو، میں چائے نہیں پیوں گا۔"

ردا کچن میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔اس نے چائے کے لئے ابھی پانی نہیں رکھا تھا۔جونہی زاہد نے کہا،وہ مسکرائی اور کچن سے باہر نکل کر پھر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"کچھ پیسے ہیں تیرے پاس؟"زاہد جمیل نے پوچھا۔

ردا نے رک کر کہا۔"نہیں۔"

"یہ جو تو کام کرتی ہے اور معاوضہ لیتی ہے،وہ رقم کہاں جاتی ہے؟"زاہد جمیل کو پھر غصہ آ گیا۔

"وہ میں کسی کو حساب دینے کے لئے نہیں کماتی۔"ردا نے جواب دیا۔

"تیری زبان بہت چلتی ہے۔"زاہد جمیل کا غصہ دوچند ہو گیا۔

"شکر ہے آپ کو یہ تو پتا چلا کہ میری زبان بہت چلتی ہے ورنہ آپ وہ واحد باپ ہیں جسے یہ نہیں پتا کہ اس کی بیٹی کس کلاس میں پڑھتی ہے۔"ردا اپنے دل کی بات فوراً زبان پر لے آئی۔

"اسی لئے میں تیری ماں سے نفرت کرتا تھا کہ وہ تیری طرح میری عزت نہیں کرتی تھی۔"زاہد پھر چلایا۔

"میری ماں بہت اچھی تھیں۔لیکن آپ نے ان سے ہمیشہ نفرت کی۔"ردا جلدی سے بولی۔

"بات بات پر مجھ سے لڑتی تھی۔گھر آئی دولت اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔"زاہد جمیل کا غصہ بدستور قائم تھا۔

"وہ حرام کی کمائی کے خلاف تھیں۔لڑائی کی اصل وجہ یہی تھی۔"ردا نے بھی جواب دیا۔

"آج اس کی بد دعا نے مجھے برباد کر دیا ہے۔سب کچھ میرے ہاتھ سے چلا گیا ہے،میرے پاس کچھ نہیں رہا،سوائے اس گھر کے۔"زاہد نے یہ کہتے ہوئے گھر کی طرف دیکھا۔

ردا کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اس کا باپ اگلا قدم کیا اٹھاتا ہے۔اس نے پریشان ہونا اور سوچنا چھوڑ دیا تھا۔وہ اپنے باپ کے ساتھ ایسی زندگی گزار رہی تھی کہ جب بھی وہ گھر آتا تھا،اس کا غصہ اس پر قہر بن کر ٹوٹتا رہتا تھا۔اگر وہ عام لڑکیوں جیسی ہوتی تو شاید اپنے آپ کو روگ لگا لیتی۔وہ باپ سے سخت نالاں تھی۔وہ ایک ایسی کشتی کی سوار تھی جو طوفان میں گھری ہوئی تھی نہیں معلوم تھا کہ ظالم موجیں اسے کنارہ دیتی ہیں یا موت......؟اس نے سب کچھ اپنی تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

زاہد جمیل نے اپنے کوٹ کی جیبوں میں باری باری ہاتھ ڈال کر پیسہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر مایوس ہو کر اس نے ردا کی طرف دیکھا۔ردا اس لئے کھڑی تھی کہ اس کا باپ جائے تو وہ دروازہ بند کر کے اپنا کوئی کام کر سکے۔

اس بار زاہد نے اس سے پیسہ نہیں مانگا اور گھر سے نکل کر دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ اس کے دھماکے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے غصے میں گھر سے گیا ہے۔

اس کے جاتے ہی ردا نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور اپنی جگہ بیٹھ کر ٹیلی ویژن آن کر لیا۔

☆......☆......☆

شہر کے پوش علاقے میں وہ ریسٹورنٹ بہت معروف تھا۔

اس ریسٹورنٹ میں دولت مند ماں باپ کی اولادیں آتی تھیں۔یہاں ان کی پسند کی چیزیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔اس ریسٹورنٹ میں ایک بڑا جوا خانہ بھی تھا جہاں تک رسائی جان پہچان اور خاص لوگوں کو دی جاتی تھی اور وہ جگہ رات گئے تک آباد رہتی تھی۔بگڑی اولادیں باپ کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لٹا کر فخر محسوس کرتی تھیں اور کچھ اپنی گرل فرینڈ کے سامنے اپنی دولت پانی کی طرح بہا دیتے تھے۔

اس جوئے خانے کے دروازے سے زاہد جمیل داخل ہوا۔اس نے کھڑے ہو کر متلاشی نگاہوں سے کسی کو دیکھا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ایک نوجوان کی طرف بڑھا۔

اس نوجوان کا نام خرم حمید تھا۔خرم ریسٹورنٹ کا باقاعدہ ملازم نہیں،بلکہ وہ ریسٹورنٹ کے مالک کا خاص آدمی تھا اور اس کا ہر حکم مانتا تھا۔کسی پارٹی سے پیسہ وصول کرنا،کسی کو پیسہ دینا،کسی سے ملنا،کسی کو لے کر آنا،کسی کو باس کا اہم پیغام پہنچانا جیسے کام اس کی ذمہ داری تھے۔

خرم کئی سال سے اس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔اس ریسٹورنٹ کے مالک کا ایک بہت بڑا کاروں کا شوروم بھی تھا۔خرم اس کے پاس آیا تو اس شوروم میں کام کرنے کے لئے تھا لیکن اس کے باس نے اس کی ایمانداری،دلیری اور اعتماد دیکھتے ہوئے اپنے دوسرے کاموں کے لئے رکھ لیا تھا۔ایک عرصہ کام کرنے کے بعد خرم کو پتا چلا کہ اس کا باس ایک معزز کاروباری اور سماجی شخصیت نظر آنے والا شخص دراصل کالے دھندے کا سربراہ ہے۔اس کا دھندا ہی کالا نہیں بلکہ دل بھی سیاہ تھا۔

خرم کام تو کر رہا تھا لیکن وہ اپنے باس سے زچ تھا۔کسی بھی وقت باس کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا اور وہ کھڑے کھڑے بے عزتی کر دیتا تھا۔خرم کبھی کبھی راہ فرار کے بارے میں سوچتا تو سوچ کر ہی رہ جاتا تھا۔

زاہد جمیل نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو خرم نے چونک کر پیچھے دیکھا اور جونہی اس کی نظر زاہد پر پڑی،وہ مسکرایا۔

"آج کیا اس ریسٹورنٹ کو لوٹنے کا ارادہ ہے؟"

"مجھے سیٹھ سے ملنا ہے۔"زاہد نے متانت سے کہا۔

"وہ تو یہاں نہیں ہوتے۔"خرم نے بتایا۔

"کہاں ملے گا؟"زاہد نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔آج چہرے پر گرم جوشی اور مسکراہٹ نہیں؟"خرم نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے سیٹھ سے ضروری کام ہے۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم آج ایک بڑی بازی ہار گئے ہو۔تم ہارتے ہی جا رہے ہو،اب اس کام سے باز کیوں نہیں آ جاتے؟"خرم نے کہا۔

زاہد نے اپنی سرخ آنکھوں سے خرم کو گھورا۔"میں تم سے مشورہ لینے نہیں آیا۔میں ہاروں یا جیتوں،تمہیں اس سے کیا؟"

"جب بھی کوئی جواری جیتتا ہے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔میں سوچتا ہوں کہ اب اس کی بربادی شروع ہو گئی ہے اور جب کوئی ہار رہا ہو تو میں موقع ملنے پر اسے مشورہ دیتا ہوں کہ اب یہ کام چھوڑ کر کوئی اور کام پکڑ لو۔"خرم اس کے غصے کی پروا کئے بغیر اطمینان سے بولا۔

"تم اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔مجھے سیٹھ کا بتاؤ،وہ کہاں ملے گا؟"اس بار زاہد نے دانت پیسے۔

"سیٹھ شوروم میں ہوتا ہے،یہاں وہ کبھی کبھار آتا ہے۔"خرم نے کہا اور پھر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

زاہد جانے کی بجائے اس کے عقب میں کھڑا رہا۔کچھ دیر کے بعد بولا۔"سب کچھ ہاتھ سے چلا گیا ہے۔میں خالی ہاتھ ہو گیا ہوں۔ایک وقت تھا میری جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں اور ہر بازی میری ہوتی تھی۔اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

خرم نے اپنا رخ پھر زاہد کی طرف کیا۔"جواری کی زندگی ان پتنگوں کی مانند ہوتی ہے جو اڑتے ہوئے کسی شاخ سے اٹک جاتے ہیں لیکن تیز ہوا انہیں کہیں گم کر دیتی ہے۔"

زاہد جمیل اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شاید اس کی زبان کو الفاظ نہیں مل رہے تھے اور وہ پیچ و تاب کھا کر وہاں سے چلا گیا۔خرم نے ایک مسکراہٹ عیاں کی اور دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں ایک میز پر ایک خوبصورت لڑکی اپنے دوست لڑکے کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی تھی۔

☆......☆......☆

اسی ریسٹورنٹ سے کچھ آگے چوراہے پر ایک بڑا کاروں کا شوروم تھا۔وہاں کئی چمچماتی کاریں کھڑی تھیں۔خرید و فروخت کے لئے آنے والے وہاں موجود تھے۔رات گئے تک وہاں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

اس شوروم کا منیجر ناصر حبیب بڑا خوش اخلاق،خوش لباس اور تیز طرار نوجوان تھا۔اس کا تعلق پنجاب کے ایک دور دراز چھوٹے سے شہر سے تھا۔وہ نوکری کے لئے اس شہر میں آیا تھا۔کئی ماہ دھکے کھانے کے بعد اسے اس شوروم میں معمولی سی نوکری ملی تھی۔بھوکا رہنے سے بہتر تھا کہ ناصر اس نوکری کو قبول کر لیتا۔رفتہ رفتہ اس کے باس کو جانے ناصر کے اندر کیا چیز نظر آئی کہ اس نے یکدم اس شوروم کے منیجر شوکت علی کے ساتھ بٹھا دیا۔

ناصر ہوشیار،تیز طرار اور زیرک تھا۔اس نے فوراً کام کو سمجھنا شروع کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے باس نے ناصر کو اس سیٹ پر بٹھا دیا اور شوکت علی کو اسی شوروم کے دوسرے کمرے میں کرسی دے دی،جہاں وہ خاص لوگوں کے ساتھ لین دین کرتا تھا جس کا ناصر کو علم نہیں تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔شوکت علی کا تعلق اس شوروم کے باس کے ساتھ تھا۔

ناصر کی اسی شوروم سے ملحق رہائش تھی۔وہ چھوٹا سا تین کمروں کا ایک منزلہ گھر تھا۔ناصر کو اچھی تنخواہ ملتی تھی لیکن اپنے باس کے سامنے اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔اس کا باس کسی غلطی پر اپنے کمرے میں بلا کر ایسی سرزنش کرتا تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ابھی اس جگہ سے چلا جائے۔لیکن باس کا اچانک کام چھوڑ کر چلے جانا،کوئی آسان کام نہیں تھا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کام چھوڑ کر چلے جانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور وہ ایسی غلطی کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا تھا۔وہ ناچار اپنے باس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

جب زاہد جمیل آفس میں داخل ہوا تو اس وقت ناصر کے پاس دو آدمی براجمان تھے۔زاہد سلام کرنے کے بعد ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

ناصر ان لوگوں کے ساتھ کاروباری گفتگو کرتا رہا۔آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں چلے گئے تو ناصر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی زاہد صاحب۔"

"مجھے سیٹھ سے ملنا ہے۔"زاہد جمیل بولا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہوں گے۔"ناصر نے کہا۔

"اکیلے ہیں؟"زاہد نے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں ان کا کمرا الگ ہے اور راستہ بھی۔اس لئے مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ اکیلے ہیں یا ان کے پاس کوئی بیٹھا ہے۔"ناصر نے کہا۔

"ذرا فون پر اطلاع کر دو کہ میں آیا ہوں۔"

"کسی کے بارے میں بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔آپ مل سکتے ہیں ان سے۔"ناصر نے کہا۔

زاہد اپنی جگہ سے اٹھا اور سیٹھ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔باس کا کمرا اوپر تھا۔شوروم کے مالک کی شخصیت ایسی تھی کہ زاہد جمیل جیسے لوگ ملنے سے پہلے گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے تھے۔زاہد کے دل میں بھی گھبراہٹ تھی۔

اس نے دروازے کے پاس جا کر دستک دی اور پھر اجازت ملنے پر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ بڑا عالیشان آفس تھا۔آفس میں قدم رکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے امیر ترین شخص کے دفتر میں داخل ہوا ہے۔بڑا سا کمرا،سامنے بڑی اور چمکتی ہوئی میز،اس کے پیچھے ریوالونگ چیئر اور وہ بھی ایسی کہ جیسے فرعون نے اپنے لئے بنوائی ہو۔دائیں بائیں کاروں کے ماڈل،انتہائی قیمتی سجاوٹ کی چیزیں کہ دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔

میز کے پیچھے کرسی پر ایک لمبے قد کا جوان لڑکا بڑی تمکنت سے براجمان اپنے قیمتی موبائل فون سے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔اس نے ایک نظر زاہد کی طرف دیکھتے ہوئے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔زاہد بیٹھ گیا جبکہ وہ موبائل فون پر باتیں کرتا رہا۔

اس جوان لڑکے کا نام روشن خان تھا۔شلوار قمیض اور سردیوں میں کوٹ اس کا خاص لباس تھا۔وہ بہت کم سوٹ میں نظر آتا تھا۔اس کی آنکھوں میں عجیب کشش تھی۔چہرہ رعب دار اور آواز میں کھنک تھی۔اس کا مضبوط جسم اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔اس کی کلائی پر روز ایک نئی گھڑی بندھی نظر آتی تھی۔قیمتی اور خوبصورت گھڑیوں کا اسے شوق تھا۔

روشن خان کے کئی کاروبار تھے۔لوگوں کو یہی پتا تھا کہ اس کا معروف ریسٹورنٹ اور یہ شوروم ہے۔لوگ یہ جانتے تھے کہ روشن خان شہر کی سیاسی اور سماجی شخصیت ہے۔اس کا اثر و رسوخ بہت اوپر تک ہے۔وہ کسی کو بھی خریدنے کی طاقت رکھتا ہے لیکن لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے کئی کالے دھندے تھے جن میں ایک جوا خانہ تھا اور چوری کی کاروں کی خرید و فروخت کا دھندا بھی تھا۔

اس کے انتہائی قریبی لوگ جانتے تھے کہ روشن خان کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔شاید اسی لئے اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔کوئی لڑکی اس کی نظر میں نہیں سمائی تھی اور اس کے دل کی سختی کا یہ عالم تھا کہ وہ جب کسی سے دشمنی کرتا تھا تو پھر اسے برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔کسی کو مارنے پر آتا تو اسے مار کر ہی دم لیتا تھا۔وہ کسی کو کسی وقت بھی بے عزت کر دیتا تھا۔اس نے کبھی کسی کی عمر کا لحاظ نہیں کیا تھا۔روشن خان سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اپنے موبائل فون کو روشن خان نے کان سے ہٹا کر اپنے سامنے میز پر رکھا اور غیر متوقع طور پر زاہد جمیل کو مسکرا کر دیکھا۔

"مجھے دس منٹ درکار ہیں۔میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"زاہد جمیل کی آواز میں عاجزی تھی۔

"تم اطمینان سے بات کر سکتے ہو۔میں اس وقت بالکل فارغ ہوں۔"روشن خان نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"آج کی ریس نے مجھے کنگال کر دیا ہے۔میں بالکل برباد ہو گیا ہوں۔"زاہد جمیل کے لہجے میں کرب تھا۔وہ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

"اس کام میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔آج کنگال کل پھر بادشاہ۔"روشن خان بولا۔

"میرے پاس کچھ نہیں رہا۔میں اب سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں کوئی بازی جیت سکوں گا کیونکہ میرے پاس بازی کھیلنے کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔"زاہد نے کہا۔

"تم میرے پاس اپنا دکھ سنانے کے لئے آئے ہو کہ میں افسوس کروں؟"روشن خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

زاہد گڑبڑا گیا۔"میرے پاس آپ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔میری کوئی مدد نہیں کر سکتا،بس آپ ہی میری آخری امید ہیں۔"

"تم کیا چاہتے ہو زاہد جمیل۔"روشن خان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔اس کی نظریں زاہد کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔جیسے وہ اس کے دل و دماغ کی کیفیت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میں اس میدان میں پھر اترنا چاہتا ہوں۔"زاہد جمیل اپنی بربادی کے باوجود اس کام سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی بات سن کر روشن خان مسکرایا۔"تمہاری ہمت کی مجھے داد دینی پڑے گی۔"

"میں ہاری ہوئی بازی جیتنا چاہتا ہوں۔یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی زاہد جمیل کسی جوئے خانے کا فاتح ہے۔زاہد جمیل جس گھوڑے پر پیسہ لگاتا ہے وہی جیتتا ہے۔"زاہد کے اندر ایک دم جوش بھر گیا۔

روشن خان نے اس کی طرف بغور دیکھا اور بولا۔"تم نے یہ نہیں سنا کہ جب گھوڑا لنگڑا ہو جائے تو پھر اس کے لئے دوڑ کا میدان اجنبی بن جاتا ہے؟"

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں لنگڑا گھوڑا ہوں جو کبھی دوڑ نہیں سکتا اور گولی اس کا مقدر بن گئی ہے؟"روشن خان کی بات سن کر زاہد جمیل کو شدید صدمہ پہنچا لیکن وہ روشن خان کے ساتھ درشت لہجے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

روشن خان ہنسا اور پھر بولا۔"تمہاری خواہش پر میں پھر سے تمہاری مرہم پٹی کر کے میدان میں اتار دیتا ہوں لیکن مجھے اس مرہم پٹی کا کیا ملے گا؟"

"جو آپ چاہیں گے۔"زاہد جمیل بلا تامل بولا۔

"پھر میں تم سے تمہاری سب سے زیادہ قیمتی چیز مانگ لوں گا۔"روشن خان کا لہجہ معنی خیز تھا اور زاہد کا دھیان سیدھا اپنے اکلوتے مکان کی طرف چلا گیا جو اس کی واحد جائیداد تھی۔

"مجھے یہ منظور ہے۔"زاہد بولا۔

روشن خان نے اپنی میز کی دراز کھولی اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر اس کے سامنے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیں اور پھر ایک خالی اسٹامپ پیپر اور بال پین بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ اٹھا لو اور اس پر دستخط کر دو۔"

زاہد نے اسٹامپ پیپر دیکھا اور بولا۔"یہ خالی ہے۔کچھ بھی نہیں لکھا۔"

"کل ریس کا پھر میدان سج رہا ہے۔مجھے یقین ہے کہ تم جیت جاؤ گے اور پھر سے اپنی جیبیں نوٹوں سے بھر کر باہر نکلو گے۔اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم اس اسٹامپ پیپر کو اپنے ہاتھوں سے پھاڑ کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دو گے۔لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ اس پر پہلے کچھ لکھا جائے تو کل بارہ بجے میرے پاس آ جانا اور پھر دستخط کر دینا،مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"یہ کہہ کر روشن خان نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس سے پہلے کہ روشن خان کا ہاتھ نوٹوں کو چھوتا،زاہد نے جلدی سے نوٹوں کی گڈیوں کو مزید اپنی طرف سرکا لیا اور بال پین پکڑ کر

ستمگر

محمد فاروق انجم

قسط: 2

رہتے ہیں۔ ہم سب کل کراچی جارہے ہیں۔“

”اچانک سب کچھ ختم کردیا؟“ ردا کو مزید حیرت ہوئی کیونکہ عائشہ کے ابو کے کاروبار کے ساتھ اس کا روزگار بھی وابستہ تھا۔

”یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ ابو کئی ماہ سے اپنا کاروبار ختم کر رہے تھے اور گھر بھی برائے فروخت تھا۔ اب سب کچھ بیچ دیا ہے اور کراچی میں گارمنٹس کی فیکٹری بھی خرید لی ہے۔ ہم نے کسی کو بتایا نہیں تھا۔ اس لئے لگتا ہے جیسے سب اچانک ہوا ہے۔“ عائشہ نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے کہیں اور کام کی تلاش کرنا پڑے گی؟“ ردا کو اپنے معاش کی فکر تھی۔

”ہاں! ایسا ہی کرنا ہوگا۔ سوری ردا۔ میں نے تمہیں وقت سے پہلے کچھ نہیں بتایا۔ دراصل ابو کسی کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔“ عائشہ نادم تھی۔

”کوئی بات نہیں عائشہ۔“ ردا اپنے روزگار کے بارے میں فکر مند ہوگئی تھی۔

عائشہ نے اپنے پرس سے ایک بند لفافہ نکالا اور ردا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ لو تمہارے کچھ پیسے ابو کی طرف نکلتے تھے۔“

ردا نے لفافہ لے لیا۔ ”شکریہ عائشہ۔“

”میں چلتی ہوں۔“ عائشہ نے کہا اور ردا سے گلے ملنے کے بعد وہ جونہی دروازے کی طرف مڑی، یکدم ردا کو ایک خیال نے جھنجھوڑ دیا۔

اس نے فوراً اپنے چہرے کی افسردگی کی چادر ایک طرف اتار کر پھینکی اور بولی۔ ”عائشہ، کیا ایک کام ہوسکتا ہے؟“

”کیا کام؟“ عائشہ نے اس کی طرف دیکھا۔

ردا نے جلدی سے دروازے کے پاس جاکر باہر جھانکا اور دروازہ بند کر کے اسے پچھلے کمرے میں لے گئی۔ عائشہ پریشان تھی کہ اچانک ردا کو کیا ہوگیا ہے۔ اس کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد ردا بولی۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں؟“

”ایسا ہوسکتا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”تم وہاں رہوگی کہاں کیونکہ ہم چند ماہ اپنے تایا ابو کے گھر رہیں گے۔“ عائشہ بولی۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ کوشش کرنا ہمارا کام ہے اور راستے بنانا خدا کا۔ بس تم لوگ مجھے اپنے ساتھ کراچی لے چلو۔“ ردا نے جلدی سے کہا۔

”میں ابو سے بات کرلیتی ہوں۔“ عائشہ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ اس کی اچھی دوست تھی۔

”تم ابو سے کہہ دینا کہ بے شک مجھے اپنی فیکٹری میں نوکری نہ دیں۔ میں خود کوئی انتظام کرلوں گی۔ بس مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”لیکن تم یہ گھر اور پڑھائی چھوڑ کر جانا کیوں چاہتی ہو؟“ عائشہ کو حیرت تھی۔

”کراچی میں فیشن انڈسٹری بہت بڑی ہے۔ وہاں میں اپنا کام دکھاؤں گی تو مجھے کہیں نہ کہیں نوکری مل جائے گی۔ یہاں اتنے مواقع نہیں ہیں۔“ ردا نے اصل بات بتانے سے احتراز کیا۔

”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میں ابو سے بات کر کے تمہیں فون کرتی ہوں۔“

”بس مجھے اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ ٹکٹ میں خود خرید لوں گی۔ کیا تم ابھی اپنے ابو کو فون نہیں کرسکتیں؟“ ردا نے کہہ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کچھ سوچنے کے بعد عائشہ نے اپنا موبائل فون نکالا اور اپنے ابو سے بات کرنے لگی۔ کچھ دیر وہ بات کرتی رہی اور پھر فون بند کر کے پُرجوش انداز میں بولی۔ ”ابو نے کہا، انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنی فیکٹری میں کام دے دیں گے۔ کل رات کی ٹرین سے ہماری روانگی ہے۔ ابو کے دوست ریلوے میں ہیں۔ وہ ان سے کہہ کر تمہارا ٹکٹ بک کرادیں گے۔“

”تھینک یو عائشہ، تھینک یو۔“ ردا نے ممنون لہجے میں عائشہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

☆.....☆.....☆

ردا نے راتوں رات پیکنگ کی اور ایک بار پھر نظر دوڑاتی ہوئی سوچنے لگی کہ کوئی ضروری چیز رہ تو نہیں گئی۔ روشن خان سے شادی کرنے سے بہتر تھا کہ وہ چپ چاپ یہ شہر چھوڑ کر کراچی میں گم ہوجائے۔ اسے یقین تھا کہ روشن خان اسے کبھی تلاش نہیں کر پائے گا۔

وہ کراچی جاکر ایک نئی زندگی شروع کرسکتی تھی۔ عائشہ کا باپ پہلے ہی ردا کے کام کا معترف تھا۔ جونہی عائشہ نے بتایا کہ وہ کراچی جانا چاہتی ہے تو اس نے سوچا کہ وہ ردا سے کم اجرت پر اچھا کام لے سکتا ہے۔

ردا تیاری مکمل کرچکی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اب اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ وہ گھر سے ریلوے اسٹیشن کیسے جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکے۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سوٹ کیس تھا۔ اس سے لوگوں کو فوراً پتا چل جائے گا کہ وہ کہیں جارہی ہے اور اگر روشن خان کو پتا چل گیا تو پھر جانے وہ پاگل کیا کر دے۔

ردا سوچنے لگی کہ کیا کرے اور کیسے یہاں سے رازداری کے ساتھ نکلے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اسی سوچ بچار میں رات بیت گئی۔

وہ دن ردا کے لئے بڑا مشکل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وقت تھم گیا ہے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ عائشہ کا دو بار فون آچکا تھا کہ وقت سے پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے۔

رات آٹھ بجے ٹرین چلنے کا وقت تھا۔ ٹھیک چھ بجے ردا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور تیزی سے چوک کی طرف چل پڑی۔

چوک میں اسے ٹیکسی مل گئی لیکن وہ سوچنے لگی کہ جب ٹیکسی گلی میں جائے گی تو کوئی ہمسایہ باہر نکل کر دیکھ لے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے پوچھ لے کہ وہ کہاں جارہی ہے؟

ردا نے ایک لمحے سوچا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے گلی میں لے گئی۔ جونہی ٹیکسی اس کے دروازے پر رکی، وہ تیزی سے باہر نکلی اور دروازے کے ساتھ رکھا اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ ٹیکسی گلی سے نکل گئی اور ردا نے سکون کی سانس لی۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اس نے کرایہ ادا کیا اور اپنا سوٹ کیس کھینچتی ہوئی اندر چلی گئی۔ وہ سوا گھنٹہ پہلے پہنچ گئی تھی۔

ریلوے اسٹیشن پر رش تھا کیونکہ ایک اور ٹرین جانے کے لئے تیار کھڑی تھی اور مسافر بھاگ دوڑ کر اس میں سوار ہو رہے تھے۔ ردا لکڑی کی اس بنچ پر بیٹھ گئی جہاں کچھ اور خواتین بھی براجمان تھیں۔ ردا کو بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ ملی تھی کہ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑسکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد عائشہ کی فیملی آگئی۔ عائشہ نے فون پر ردا سے رابطہ کیا اور وہ سب ٹرین میں سوار ہوگئے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ردا کو اس بات کی جلدی تھی کہ ٹرین چل پڑے۔ ساڑھے آٹھ ہوگئے لیکن ٹرین نہیں چلی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ ٹرین لیٹ ہے۔ ردا کے لئے پریشانی بڑھ گئی۔ اس کیفیت میں مزید وقت گزر گیا۔ عائشہ کی فیملی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور خوش گپیوں میں مصروف تھی جبکہ ردا بار بار کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔

اچانک کچھ مسافر اور چڑھے اور ان کے ارد گرد رش ہوگیا۔ ردا نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور عائشہ کی فیملی آپس میں باتوں میں مشغول تھی۔

ڈبے میں داخل ہونے والے مسافر بیٹھ چکے تھے اور ان کے پاس جو رش سا ہوا تھا، وہ ختم ہوچکا تھا۔ اچانک ٹرین رینگنے لگی۔ ردا نے سکون کا سانس لیا اور اس وقت اس کی آنکھیں ششدر رہ گئیں جب اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ اس کا سوٹ کیس ایک عورت زمین پر رکھے کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

ردا نے جلدی سے اٹھ کر اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ وہاں سوٹ کیس نہیں تھا۔ ردا حیران تھی کہ اس کا سوٹ کیس کب اور کس وقت اس عورت نے اٹھایا اور اسے لے کر اتر گئی؟

”کیا ہوا؟“ عائشہ نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا۔

”میرا سوٹ کیس اس عورت کے پاس ہے۔“ ردا کہتی ہوئی جلدی سے ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سوٹ کیس میں اس کی تھوڑی سی جیولری، تعلیمی اسناد اور کچھ اہم سامان تھا۔ عائشہ اسے آوازیں دیتی رہی۔

ٹرین نے رفتار پکڑلی تھی۔ عائشہ اس کے پیچھے لپکی۔

”ٹرین چل پڑی ہے۔ تم کہاں جارہی ہو؟“ اس کے باپ نے عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”ردا کا سوٹ کیس وہ عورت لے گئی ہے۔“

”اب کیا کریں۔ دفع کرو اور بیٹھ جاؤ۔ اب ٹرین نہیں رکے گی۔“ عائشہ کے باپ نے زبردستی اسے بٹھالیا۔

ردا رفتار پکڑتی ٹرین سے نیچے اتر گئی اور وہ اس عورت کی طرف بھاگی جو اس کا سوٹ کیس لئے کھڑی تھی۔ جب ردا اس عورت کے پاس پہنچی، ٹرین آگے نکل چکی تھی اور عائشہ دم بخود ناچار کھڑکی سے ردا کو دیکھ رہی تھی۔

ردا اس عورت کے قریب جاکر بولی۔ ”یہ میرا سوٹ کیس ہے۔“

ردا کی بات سن کر وہ عورت مسکرائی اور عین اس وقت ایک آدمی آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر خارجی دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے وہ عورت بھی چلنے لگی۔

ردا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ چلائی۔ ”تم میرا سوٹ کیس لے کر کہاں جارہی ہو؟“

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ ردا ان کے پیچھے بھاگی۔ اس کی متلاشی نگاہیں کسی پولیس والے کو دیکھ رہی تھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کوئی اس کے بالکل ساتھ چل رہا ہے۔ ردا نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک اور عورت اس کے برابر چل رہی تھی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا، چہرے پر نقاب نہیں تھا۔

”شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہمارے ساتھ چلتی رہو۔“

”تم کون ہو؟“ ردا نے پوچھا۔

”وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے، اس میں بیٹھ جاؤ۔ تمہاری کوئی ایسی حرکت جو ہمیں پسند نہ آئے، تمہیں گولی کا نشانہ بنا سکتی ہے۔“ اس عورت نے اطمینان سے دھمکی دی۔

”تم ہو کون؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ردا نے پھر پوچھا۔

اس عورت نے اس سوال کا جواب دینا شاید مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتی رہی۔ سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ اس عورت نے کار کا دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھ گئی۔ اس کا سوٹ کیس ڈکی میں رکھا جاچکا تھا۔ ردا اس خیال سے کہ اس کے شور مچانے یا مزاحمت کرنے سے اس کے ساتھ جانے کیا سلوک ہو، وہ بھی کار میں بیٹھ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ردا ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ کار چل پڑی۔ ردا سوچ رہی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے اس کا سوٹ کیس کیوں ٹرین سے باہر نکالا اور اگر وہ اپنا سوٹ کیس لینے نیچے نہ اترتی تو وہ اس مشکل میں نہ پھنستی۔ جانے آگے کیا ہو؟ وہ ابھی ان باتوں میں الجھی ہوئی تھی کہ اسے لگا جیسے کوئی سوئی چبھی ہے۔ اس نے اپنے برابر بیٹھی عورت کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوگئیں۔

☆.....☆.....☆

ردا نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں اور چھت کی طرف دیکھا۔ چھت پر لگا پنکھا اس کی نظروں میں تھا۔ اس کا دماغ بالکل خالی تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت کہاں ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کرلیں۔ کچھ دیر کے بعد کھولیں تو اس کی نظروں کے سامنے چھت پر لٹکتا ہوا پنکھا بڑا واضح تھا۔ اسے لگا جیسے اس نے وہ پنکھا اس سے قبل بھی کئی بار دیکھا ہے۔ اس نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہ چونکی۔ یہ تو اس کا کمرا ہے۔ وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے بیڈ پر تھی اور کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔

اچانک اس کی سماعت سے ٹھک.....ٹھک کی آواز قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کوئی اس کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ پھر دروازے کا ہینڈل گھوما اور دروازہ کھلتے ہی روشن خان کا چہرہ نمودار ہوا۔

روشن خان نے ایک لمحے رک کر دیکھا اور پھر کمرے میں داخل ہوکر دروازہ بند کردیا۔ ردا اسے متحیر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں اور چہرے پر خوف تھا۔

روشن خان نے پاس پڑی کرسی اٹھائی اور اسے سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ ردا خوف زدہ تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ اس خوف میں اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

”تو تم یہ شہر چھوڑ کر جارہی تھیں؟“ روشن خان بولا۔

”میں اپنی دوست کے ساتھ کراچی دیکھنا چاہتی تھی۔“ ردا نے کہا۔

”مجھے کہتیں، میں جہاز کا ٹکٹ لے دیتا۔“

”میں نے کبھی ٹرین کا سفر نہیں کیا تھا۔“ ردا کو اتنا اطمینان تھا کہ وہ اغوا نہیں ہوئی، اپنے ہی گھر میں ہے۔ اس لئے اس کا خوف رفتہ رفتہ معدوم ہو رہا تھا۔

”تم مجھے بتائے بغیر ٹرین میں بیٹھ گئیں؟“ روشن خان نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں آپ کو کیوں بتاتی؟“

”کیونکہ تم میری مقروض ہو اور میرا پیسہ دیئے بغیر کہیں نہیں جاسکتیں۔“ روشن خان بولا۔

”مقروض میں نہیں، میرا باپ تھا۔“

”اور تم نے اس کی ضمانت دی تھی۔“

”یہ جھوٹ ہے، فریب ہے، فراڈ ہے۔“ ردا بولی۔

”تو اسے عدالت میں ثابت کردو ورنہ میں سچ ثابت کردیتا ہوں۔“ روشن خان نے کہا اور ردا اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں اسے بہت کچھ کہہ گئی۔

روشن خان کھڑا ہوگیا۔ ”ہم اگلے ہفتے شادی کر رہے ہیں۔ اگلے ہفتے کا مطلب ہے اتوار کے دن ہماری شادی ہے۔“

”میں نے ابھی آپ کو کوئی جواب نہیں دیا۔“ ردا نے کہا۔

”اب مجھے تمہارے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”میں اس فیصلے کو نہیں مانتی۔“ ردا کو غصہ آگیا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ روشن خان دروازے کی طرف بڑھا۔

”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے۔ میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ ردا چلائی۔

روشن خان نے اس کی طرف دیکھا۔ ”چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے چلانے سے میں اپنا فیصلہ نہیں بدل لوں گا۔“

”میں پھر بھاگ جاؤں گی۔“ ردا نے دھمکی دی۔

”تمہاری پہلی غلطی معاف کردی ہے۔ دوسری غلطی معاف نہیں کروں گا اور یاد رکھو جب میں کسی سے نفرت کرتا ہوں تو پھر میری نفرت دوسرے کی زندگی میں زہر بن کر ایسا طوفان برپا کرتی ہے کہ اس کا وجود مٹ جاتا ہے۔“ روشن خان کا ایسا درشت لہجہ تھا کہ وہ ایک دم ڈر کر اسی جگہ ساکت ہوگئی۔

کمرے میں خاموشی نے اپنے پنجے جمالئے۔ کچھ دیر کے بعد روشن خان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ ساتھ ہی اس کے لہجے میں بھی تغیر آگیا۔ ”تم مجھے غصہ نہ دلایا کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ یوں پیش آؤں جیسے پھول کی پنکھڑی کو کوئی آہستہ سے چھوئے۔ تم نے ایسی بات کہہ دی کہ مجھے غصہ آگیا ورنہ میں تم سے اس لہجے میں بات نہ کرتا۔“

ردا نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ روشن خان کھڑا رہا۔ ایک بار پھر اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ”میں جارہا ہوں، تم آرام کرو۔“ اس کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ ردا نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

ردا نے کچھ سوچا اور پھر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھتی گئی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا، باہر سے مقفل نہیں تھا۔

ردا نے دروازہ کھول کر ڈرتے ہوئے باہر جھانکا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔

ردا نے دروازہ مقفل کیا اور جونہی وہ جانے کے لئے مڑی، اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینے سے اچھل کر باہر آجائے گا۔ سانس یکدم پھول گئی اور اس کی ششدر نگاہیں اپنے سامنے کھڑی اس عورت کو دیکھنے لگیں جو ریلوے اسٹیشن سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ وہ عورت ہاتھ میں چائے کا مگ لئے کھڑی تھی۔ ردا اپنی سانس درست کرنے لگی۔

جب ردا کی سانس ٹھیک ہوئی اور دل کی منتشر دھڑکنیں اپنی جگہ لوٹنے لگیں تو اس نے پوچھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”چائے پی رہی ہوں۔“ اس عورت نے اطمینان سے جواب دینے کے بعد کرسی سنبھال لی اور چائے کی چسکی لی۔ ”کہو تو تمہارے لئے بھی ایک کپ چائے کا بنادوں۔ میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں۔“

”تم کب سے ہو یہاں؟“ ردا نے اس کی بات نظر انداز کی۔

”میں بہت دیر سے یہاں ہوں کیونکہ میں تمہیں خود اٹھا کر اس گھر میں لائی تھی۔ تم بڑی ہلکی پھلکی ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے روئی کی گٹھڑی اٹھائی ہو۔“ عورت نے بتایا۔

”تم مجھے اٹھا کر لائی تھیں۔ سارا محلہ دیکھ رہا ہوگا کہ مجھے کیا ہوا ہے اور تم لوگ کون ہو۔“ ردا کو سن کر حیرت ہوئی۔

”ہمارا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ تمہیں کب ہم نے کار سے نکال کر بیڈ پر لٹا دیا۔ ویسے بھی یہ گلی بڑی پُرسکون ہے۔ لگتا ہے لوگ کم ہی گھروں سے باہر نکلتے ہیں اور پھر تمہیں ہم نے یہ پتا چلنے دیا تھا کہ کب تمہارا سوٹ کیس اٹھا کر ہم ٹرین سے باہر لے گئے تھے؟“

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

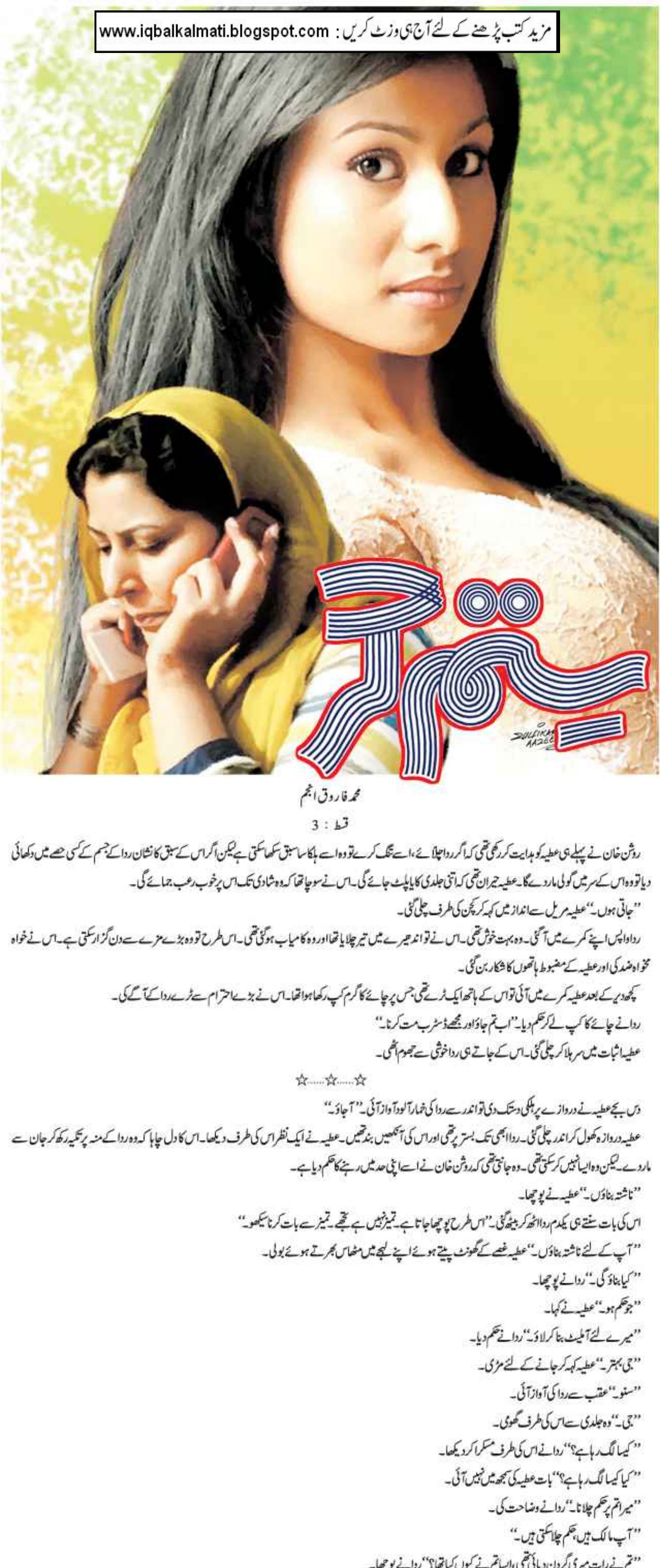

ستمگر

محمد فاروق انجم

قسط : 3

(جاری ہے)

محمد فاروق انجم

قسط: 4

"تم زاہد جمیل کو جانتے ہو۔ وہی جواری۔ اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم کل میرے نکاح میں ضرور شریک ہوگے۔" روشن خان نے کہا۔

"اس کی کوئی بیٹی بھی تھی؟" سکندر نے کریدا۔

"ہاں۔ دو، چار دن پہلے تم میرے شوروم میں آئے تھے تو ایک لڑکی شوروم سے باہر نکل کر گئی تھی۔ وہ اس کی بیٹی ردا ہے۔ اور اسی سے میں نکاح کر رہا ہوں۔" روشن خان نے تفصیل سے بتایا۔

سکندر کی آنکھوں کے آگے اس لڑکی کا چہرہ گھوم گیا۔ حسد کی چنگاری اس کے دل میں اٹھی اور اس چنگاری نے اس کے دل کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"تو تم اس لڑکی سے نکاح کر رہے ہو؟" سکندر اپنے اندر کا لاوا دبا کر بولا۔

"ہاں۔" روشن خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے تم نے بتایا ہی نہیں۔" سکندر نے شکایت کی۔

"میں نے سوچا کہ تم اپنے کام سے فارغ ہو جاؤ تو پھر بات کروں گا۔" روشن خان نے کہا۔

"اب تمہارے نکاح میں ضرور شرکت کرنی پڑے گی۔ چاہے مجھے کسی کے کندھے پر سوار ہو کر ہی کیوں نہ آنا پڑے۔" سکندر نے ہنستے ہوئے کہا اور روشن خان بھی ہنسنے لگا۔

اس دوران سکندر کو فون پر اطلاع ملی کہ ناصر کہیں نہیں ملا۔ پورا جنگل چھان لیا ہے۔ سکندر نے سن کر حکم دیا کہ وہ جنگل سے باہر نہیں آئیں گے جب تک وہ انہیں حکم نہ دے۔

سکندر کے اعصاب پر ردا چھائی ہوئی تھی۔ وہ روشن خان سے رقابت محسوس کرنے لگا تھا۔

☆.........☆.........☆

خرم نے سوچا کہ رات کا انتظار کرنے کی بجائے اگر وہ اسی وقت نکل جائے تو اچھا ہے۔ راستہ صاف ہے۔ روشن خان اپنے نکاح کی تیاری میں مصروف ہے۔ اس کے پاس فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔ کیونکہ جو کام اس کے ذمے تھا، اس تحصیل سے سہ پہر کے بعد اسے جانا تھا۔

خرم نے اپنے کمرے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ وہ کار روشن خان کے آدمی کی تھی۔ وہ آدمی سامنے والی عمارت کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔

خرم نے سوچا کہ وہ اس سے کار کی چابی مانگ کر اس میں فرار ہو جائے۔ دور جا کے وہ اس کار کو چھوڑ کر کسی اور سواری میں نکل جائے گا۔

پھر اس نے سوچا کہ چابی مانگنے پر اسے کئی سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ پیدل نکل کر ٹیکسی میں سوار ہو کر فرار ہو جائے تو اس میں آسانی یہ ہوگی کہ اس کے فرار کا کافی دیر کے بعد پتا چلے گا۔ کار مانگ کر لے گیا تو دیر ہونے پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور جب رابطہ نہیں ہوگا تو روشن خان کو تشویش لاحق ہو جائے گی اور وہاں سے آدمی اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔

خرم نے باتھ روم کے روشن دان سے خالی بوتلیں ہٹا کر رقم نکالی اور اسے اپنی چمڑے کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر اوپر سے زپ بند کر دی۔ جیکٹ پہن کر اس نے اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ وہ جگہ پھولی ہوئی تو نہیں لگ رہی۔ پانچ پانچ ہزار کے بڑے نوٹ تھے، اس لئے پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں اتنی موٹی رقم موجود ہے۔

اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد خرم نے کمرے میں نظر دوڑائی اور پھر ابھی اس نے جانے کے لئے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر روشن خان کا نمبر دیکھا اور بادل نخواستہ فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"کہاں ہو تم اس وقت؟" روشن خان نے پوچھا۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں۔" خرم نے بتایا۔

"تم ابھی زاہد کے گھر چلے جاؤ۔ جانتے ہو نا کہ میں کس زاہد کی بات کر رہا ہوں۔" روشن خان کا کرخت لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

"جی جانتا ہوں۔" خرم بولا۔

"بیس منٹ میں تمہیں اس کے گھر ہونا چاہئے۔ جاتے ہی مجھے فون کرنا۔" یہ کہہ کر روشن خان نے فون بند کر دیا۔

خرم نے اپنا موبائل فون کھول کر اس کی بیٹری نکالی اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "معافی چاہتا ہوں روشن خان صاحب۔ میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ کیونکہ مجھے یہ شہر چھوڑ کے جانا ہے۔"

خرم نے ایک بار پھر دروازہ کھولا اور باہر قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ سامنے وہ آدمی کھڑا تھا جو سامنے رہتا تھا اور جس کی کار نیچے کھڑی تھی۔

"تمہارا موبائل کیوں بند ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ...... گر گیا تھا۔ بیٹری نکل گئی تھی۔" خرم گڑبڑا گیا۔

"بیٹری دوبارہ بھی لگ سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"میں خان صاحب کے حکم پر ایک جگہ جا رہا ہوں۔ سوچا ٹیکسی میں بیٹھ کر بیٹری ڈال لوں گا۔" خرم بولا۔

"مجھے ابھی خان صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں زاہد کے گھر چھوڑ کر آؤں۔ میرے ساتھ چلو۔" اس نے بتایا تو خرم سوچ میں پڑ گیا۔

اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑی رقم موجود تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اندر جا کر پہلے رقم نکال کر کسی محفوظ جگہ رکھے یا اسی طرح اس کے ساتھ چل پڑے۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ وہ رقم نکالنے کی بجائے اسی طرح چل پڑے تو زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ کسی بھی وقت اسے بھاگنے کا موقع مل گیا تو وہ فوراً فرار ہو جائے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں چلو۔" خرم بولا۔

دونوں نیچے آئے اور کار میں بیٹھتے ہی اس شخص نے کار اسٹارٹ کی اور زاہد کے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ زاہد کے گھر کے سامنے کار روکتے ہی وہ بولا۔ "اتر جاؤ۔ مجھے بس تمہیں چھوڑنے کا حکم تھا۔"

خرم چپ چاپ کار سے باہر نکل آیا۔ اس نے جان بوجھ کر اپنا موبائل فون نکال لیا اور ایسا ظاہر کرنے لگا کہ جیسے وہ بیٹری ڈالنے لگا ہو۔ دراصل وہ یہ چاہتا تھا کہ کار وہاں سے چلی جائے اور وہ اسی جگہ سے فرار ہو جائے۔

"یہ کام اندر بھی ہو سکتا ہے۔" اس شخص نے کہا۔

"تم جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہوگیا۔" خرم بولا۔

"تم اندر جاؤ گے تو میرا کام ختم ہوگا۔" اس نے کہا۔

ناچار خرم نے موبائل فون اپنی جیب میں ڈالا اور دروازے کے پاس جا کر بیل دی۔ کچھ دیر کے بعد عطیہ نے دروازہ کھولا۔ خرم کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں عطیہ بھی رہتی ہے۔ دونوں کے درمیان دعا سلام ہوئی اور خرم اندر چلا گیا۔ عطیہ نے دروازہ بند کر دیا اور وہ شخص اس جگہ سے کار نکال کر لے گیا۔

"کوئی اور بھی ہے اندر؟" خرم نے پوچھا۔

"میرے علاوہ ایک لڑکی ردا ہے۔" عطیہ نے بتایا۔

"مجھے کیوں بلایا ہے یہاں؟" خرم نے پوچھا۔

"مجھے بس یہی بتایا گیا تھا کہ تم آرہے ہو۔ تمہارے آنے پر میں خان صاحب کو فون کروں۔" عطیہ نے کہتے ہوئے اپنا موبائل فون نکالا اور نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔ کچھ دیر کے بعد روشن خان کی آواز آئی۔ "خرم آگیا؟"

"جی وہ آگیا ہے۔" عطیہ نے جواب دیا۔

"فون دو اسے۔" روشن خان نے حکم دیا اور عطیہ نے فون خرم کی طرف بڑھا دیا۔

"جی خان صاحب؟" خرم نے فون کان سے لگاتے ہی پوچھا۔

"ردا نے بیوٹی پارلر جانا ہے۔ تم اور عطیہ، ردا کے ساتھ جاؤ گے۔ باہر میری گاڑی آچکی ہوگی۔ خیال رکھنا۔" روشن خان نے حکم دیا۔

"جی بہتر۔" خرم بولا۔

"اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ سمجھ گئے؟" روشن خان نے سختی سے تاکید کی۔

"جی سمجھ گیا۔" خرم بولا۔ اس کا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ردا اپنے کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر خرم کو فون پر بات کرتے ہوئے سن رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا بات ہو رہی ہے۔

جب خرم فون بند ہونے کے بعد دروازہ کھول کر باہر روشن خان کی پجیرو دیکھ رہا تھا، اس وقت ردا کمرے کا دروازہ بند کر کے ٹہلتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کچھ پریشان اور عجلت میں ہے۔

ردا نے بڑی چاہت سے روشن خان کو فون کر کے کہا تھا کہ اس نے تیار ہونے کے لئے بیوٹی پارلر جانا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ روشن خان اسے عطیہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن اس نے خرم کو بھیج دیا تھا۔ وہ خرم کو دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔ اس سے ملاقات ہو چکی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ روشن خان کو پسند نہیں کرتا۔

ردا نے کچھ سوچا اور پھر کاغذ اور پنسل لے کر کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے گولا بنا کر اپنی مٹھی میں لیا اور کمرے سے باہر آگئی۔

خرم ایک طرف کھڑا تھا۔ پجیرو میں روشن خان کا محافظ بیٹھا تھا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ اب بھاگنے میں ناکام ہوا تو پھر وہ کبھی نکل نہیں پائے گا۔ اس وقت اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔

عطیہ دوسرے کمرے میں تھی۔ ردا نے نظر دوڑائی اور ہولے سے بولی۔ "آگئے روشن خان کے غلام۔"

ردا کی آواز سن کر وہ اس کی طرف گھوما، اور مسکرا کر بولا۔ "زنجیروں سے تو وہ آپ کو بھی باندھنے والے ہیں۔"

"مجھے باندھنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"روشن خان کے لئے کیا مشکل ہے۔"

"میرا ساتھ دو گے؟" اچانک ردا نے پوچھا۔

خرم چونکا۔ "کیسا ساتھ؟"

"میں بھاگنا چاہتی ہوں۔ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ کیا آپ میں ہمت ہے کہ آپ میری مدد کر سکیں۔" ردا کا لہجہ دھیما اور نگاہیں کمرے کے بند دروازے پر مرکوز تھیں۔

خرم کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ روشن خان کی دنیا سے تو وہ خود بھی بھاگ رہا ہے۔ اگر وہ ردا کی بھی مدد کرے تو ردا کے لئے یہ اچھا ہوگا۔ وہ ایک طرح سے نیکی کرے گا کیونکہ وہ روشن خان کو جانتا تھا۔ ایک انسان کے روپ میں وہ درندہ تھا۔

اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا اور ردا نے پھرتی سے اپنے ہاتھ میں کاغذ کا ننھا سا گولا خرم کے ہاتھ میں دے دیا اور خرم نے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"میں تیار ہوں...... چلیں؟" عطیہ نے باہر نکلتے ہی کہا۔

ردا کوئی جواب دینے کی بجائے دروازے کی طرف چل پڑی۔ عطیہ کے پیچھے خرم نے بھی اپنے قدم بڑھا دیئے۔

باہر روشن خان کی پجیرو کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خطرناک شکل وصورت کا شخص براجمان تھا جو روشن خان کا ڈرائیور اور محافظ بھی تھا۔ خرم پیچھے تھا، اس لئے اس نے پھرتی سے کاغذ نکال کر پڑھا۔ اس پر ایک سطر لکھی تھی۔

"کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں روشن خان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" یہ بات وہ زبانی بھی اس سے کہہ چکی تھی۔

خرم نے کاغذ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اور وہ سب پجیرو میں سوار ہوگئے۔ پجیرو کو کہاں جانا ہے، اس بارے میں عطیہ نے ڈرائیور کو بتایا۔ گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ اندر خاموشی تھی۔

خرم سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ردا بھی فرار چاہتی تھی۔ خرم نہیں چاہتا تھا کہ ردا کی شادی روشن خان سے ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ردا کی ضرور مدد کرے گا۔ لیکن یہ مشکل اپنی جگہ تھی کہ وہ روشن خان کے محافظ اور عطیہ جیسی شاطر عورت کی موجودگی میں کیسے فرار ہوں۔ فرار ہونے کے لئے ان کے پاس چند گھنٹے تھے۔ شام کو روشن خان کا ردا سے نکاح تھا اور اگر اس کا نکاح ہوگیا تو ردا کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

پجیرو پوش علاقے کے ایک معروف بیوٹی پارلر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اچانک جانے ردا کے ذہن میں کیا آیا کہ اس نے تیز آواز میں کہا۔ "گاڑی روکو...... گاڑی روکو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے بریک لگا دیا۔ عطیہ نے سوالیہ نگاہوں سے ردا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے چاٹ کھانی ہے۔" ردا نے پیچھے ایک معروف چاٹ کی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ردا کی بات ٹالنا عطیہ کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی بیک کر کے اس دکان کے سامنے لے جائے۔ ڈرائیور نے پجیرو بیک کی اور دکان کے سامنے کھڑی کر دی۔ ردا نے دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے لئے ابھی ایک قدم زمین پر رکھا ہی تھا کہ عطیہ بولی۔ "چاٹ یہیں منگوا لیتے ہیں۔"

"گاڑی میں بیٹھ کر کھانے کا بھلا کیا مزہ۔" ردا یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اسی اثنا میں خرم بھی باہر آگیا۔ عطیہ ابھی باہر نکلنے کے لئے متحرک تھی کہ ردا نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہ فرار کے لئے کیا ہے۔ جلدی سوچ لو کیا کرنا ہے۔"

خرم کی سمجھ میں آگیا کہ ردا نے چاٹ کھانے کی کیوں فرمائش کی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، اطراف کا جائزہ لیا اور ان کے ساتھ اندر چلا گیا جبکہ ڈرائیور پجیرو میں ہی بیٹھا رہا۔

"میں ذرا باتھ روم جا رہا ہوں۔" خرم بولا۔

"مجھے بھی جانا ہے۔" ردا فوراً بولی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" عطیہ نے کہا۔

وہ اس علاقے کی ایک خوبصورت جگہ تھی۔ جہاں فاسٹ فوڈ کے ساتھ چٹخارے دار کھانے کی چیزیں ملتی تھیں۔ ہال میں میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ایک طرف خواتین اور مردوں کے لئے باتھ روم تھے۔

خرم ایک باتھ روم میں گھس گیا۔ جبکہ عطیہ، ردا کو لیڈیز ٹوائلٹ کی طرف لے گئی۔ ردا ایک ٹوائلٹ کے اندر چلی گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جونہی ردا اندر گئی، یکدم خرم تیزی سے آیا اور عطیہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تیزی سے ایک ٹوائلٹ میں لے گیا اور اندر جا کر اس نے عطیہ کی گردن پر ایسا وار کیا کہ عطیہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔ خرم نے اس کے دوپٹے سے اس کے ہاتھ اور منہ باندھ کر فرش پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور باہر نکل کر باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا۔

ردا پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ وہ ردا کو لے کر آگے بڑھا۔ جونہی وہ ہال میں آئے، سامنے سے ایک آدمی چلا آرہا تھا۔ خرم کی اس حوالے سے اس کی جان پہچان تھی کہ وہ روشن خان کے جائز، ناجائز کام کرتا تھا۔

"ارے خرم تم یہاں۔"

"تمہارے پاس گاڑی ہے۔" خرم نے اس کی گرم جوشی کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ میں پکڑی چابی سامنے کر دی۔

"تم بیٹھ جاؤ۔ میں روشن خان صاحب کا ایک کام کر کے ابھی آیا۔ گاڑی وہی ہے نا سرخ رنگ کی؟"

"ہاں...... مگر؟"

وہ شخص اس جگہ معلق ہوگیا اور خرم، ردا کو لے کر دروازے سے باہر نکل گیا جس دروازے سے وہ اندر آئے تھے۔ کیونکہ آنے جانے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ خرم کے پاس سوچنے کے لئے بالکل وقت نہیں تھا۔ اگر عطیہ کو ہوش آگیا یا اس ٹوائلٹ میں کوئی خاتون چلی گئی تو ایک شور برپا ہو جائے گا۔

روشن خان کا محافظ پجیرو میں بیٹھا، دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس کے بائیں جانب اس شخص کی سرخ کار کھڑی تھی۔ خرم کی تیز نظر اس کار پر رک گئی۔ وہ ردا کو لے کر اس کار کی طرف بڑھا۔ اس نے کار کے دروازے میں چابی لگائی، دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتے ہی اس نے کار کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ردا بھی پھرتی سے اندر بیٹھ گئی۔ برابر پجیرو کھڑی تھی۔ ڈرائیور کا دھیان دوسری طرف تھا۔ اس کے بائیں جانب کیا ہو رہا ہے، وہ اس سے بے خبر تھا۔

خرم نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے بیک کرنے کے بعد گیئر لگایا۔ کار کے ٹائر چیخے اور کار اس جگہ سے گولی کی طرح نکلی۔ جب اس کار کے ٹائر چیخے تو ڈرائیور نے کار کی جانب دیکھا لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا مشکل تھا کہ کار کے اندر کون سوار ہے۔

اندر ایک ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہے۔ کیونکہ جونہی ایک لڑکی اس ٹوائلٹ میں گئی تو اس نے عطیہ کو بے ہوش دیکھ کر شور مچا دیا تھا۔ لوگ جمع ہوگئے اور پھر عطیہ کو وہ ایک کمرے میں لے گئے۔ اندر عطیہ کو ہوش میں لانے کی کوشش ہو رہی تھی اور ڈرائیور بے خبر پجیرو میں براجمان مونچھوں کو تاؤ دیئے جا رہا تھا۔

☆.........☆.........☆

روشن خان کو ایک بند لفافہ موصول ہوا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اندر تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر دیکھا۔ وہ کاغذ اس تحریر کی نقل تھی جو خرم نے نقد چالیس لاکھ روپے وصول کرتے ہوئے دی تھی۔

روشن خان نے اکاؤنٹینٹ کو فون کیا اور پوچھا کہ خرم نے کل چالیس لاکھ روپے جمع کرائے ہیں۔ دوسری طرف سے جواب دیا گیا کہ خرم نے کل یا آج کوئی رقم جمع نہیں کرائی۔

روشن خان نے فوراً خرم کو فون کیا۔ خرم کا فون بند تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے پہلے خرم نے کبھی ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے پیسہ بھی جمع نہیں کرایا اور اس کا فون بھی بند ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے عطیہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "خان جی غضب ہوگیا۔"

"کیا ہوگیا؟"

"خرم نے مجھے بے ہوش کیا اور ردا کو لے کر بھاگ گیا۔" عطیہ نے کپکپاتے ہونٹوں سے بتایا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" روشن خان چیخا۔

"خان جی میں سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی......" عطیہ نے اپنی صفائی دینا چاہی۔

"سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی تو پھر یہ کیسے ہوگیا؟" روشن خان نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

"خرم نے اچانک میری گردن پر کوئی سخت چیز مار کر بے ہوش کیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو وہ ردا کو لے کر جا چکا تھا۔" عطیہ بولی۔

روشن خان یہ سنتے ہی غصے میں لال پیلا ہوگیا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

عطیہ نے جگہ کا نام بتا دیا۔ اسی وقت روشن خان نے اپنے ساتھ آدمی لئے اور گاڑی اس طرف دوڑنے لگی۔

روشن خان سوچ رہا تھا کہ ردا اور خرم کے بھاگنے کی آخر وجہ کیا ہے۔ کیا دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو یہ کب ہوا؟ اور اس کی ناک کے نیچے دونوں عشق لڑاتے رہے اور وہ جان بھی نہ سکا۔

روشن خان کو اپنی سوچ میں سچائی دکھائی دی۔ دونوں کا ایک ساتھ بھاگنا اور وہ بھی اس وقت جب وہ اس سے نکاح کرنے جا رہا تھا، اور یہ کہ خرم نے جو اتنی بڑی رقم وصول کی تھی، وہ جمع نہیں کرائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ دونوں ایک ساتھ فرار کا پہلے سے منصوبہ بنا چکے تھے۔

ان کی گاڑی جونہی اس جگہ رکی، روشن خان اور اس کے آدمی گاڑی سے گولی کی طرح باہر نکلے۔ ان کے اردگرد لوگ جمع ہوگئے تھے۔ وہاں موجود لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ یہاں آنے والی لڑکی اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔

روشن خان نے جب لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف مرکوز دیکھیں تو اسے احساس ہوا کہ اس نے غصے اور جوش میں آکر غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا اور عطیہ کو اپنے پاس بلایا ہی تھا کہ وہ آدمی بھاگتا ہوا روشن خان کی طرف بڑھا جس سے خرم کار کی چابی مانگ کر لے گیا تھا۔

"خرم میری کار لے گیا ہے۔"

"تمہاری کار لے گیا ہے؟ کیوں؟"

"کہہ رہا تھا کہ آپ کے کسی کام سے جانا ہے۔ بہت ضروری ہے۔" اس نے بتایا۔

روشن خان نے اس سے کار کا نمبر پوچھا اور سکندر کو فون کر کے اختصار سے بتاتے ہوئے کار کا نمبر بتایا اور بولا۔ "ناکہ لگا دو۔ یہ کار شہر سے باہر نہ جانے پائے۔"

روشن خان نے فون بند کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اس نمبر کی کار کی تلاش میں نکل جائیں۔ اس کے آدمی جیپ میں سوار ہو کر نکل پڑے۔ جبکہ روشن خان نے عطیہ کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ عطیہ ڈری اور سہمی پجیرو میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور بھی گھبرایا ہوا تھا۔ جونہی پجیرو اس جگہ سے نکلی، روشن خان پھٹ پڑا۔

"اگر مجھے ردا نہ ملی تو یاد رکھو میں تم دونوں کو جلتی بھٹی میں پھینک دوں گا۔"

"خان جی میں تو باہر بیٹھا تھا۔" ڈرائیور جلدی سے بولا۔

"تیرا دھیان کس طرف تھا۔ تجھے یہ پتا نہیں چلا کہ اس دروازے سے کوئی باہر نکلا ہے۔" روشن خان نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

"پتا نہیں جی، وہ دونوں کس طرف سے نکل گئے۔"

"اور تو کیا کر رہی تھی؟ تجھے یہاں رکنے کی ضرورت کیا تھی؟" روشن خان نے کہا۔

روشن خان کی غصے بھری آواز سن کر عطیہ مزید سہم گئی۔ روشن خان کا پارہ چڑھتا ہی جا رہا تھا۔

☆.........☆.........☆

سکندر سوچتے ہوئے اپنی ٹھوڑی کھجا رہا تھا۔ اس کے لئے یہ خبر بڑی حیران کن تھی کہ جس لڑکی سے روشن خان شادی کرنے جا رہا تھا، وہ اس کے ملازم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ سکندر اس لڑکی کا پہلی نظر میں ہی دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس خبر نے سکندر کے جسم میں بجلی بھر دی تھی۔

اس نے اسی وقت اپنے ایک انتہائی خاص اہلکار کو فون کر کے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اہلکار جس کا نام اکبر تھا، ابھی اس سے ملاقات کر کے نکلا ہی تھا کہ کال آتے ہی الٹے پاؤں واپس آگیا۔ سکندر نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی، جس پر گاڑی کا نمبر، رنگ، لڑکی اور لڑکے کا نام لکھا ہوا تھا۔

"ابھی ناکہ بندی کرا دو۔ یہ گاڑی شہر سے نکلنے نہ پائے۔ لڑکا اور لڑکی مل جائیں تو لڑکے کو اسی جگہ گولی مار دینا اور لڑکی کو محفوظ جگہ پہنچا دینا۔"

"اوکے۔" اکبر نے چٹ لی اور کمرے سے نکل گیا۔

اسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا سکندر پُرجوش ہوگیا تھا۔ ردا کو پانے کا جوش اس کے جسم میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اب وہ بس یہی چاہتا تھا کہ اکبر کو ان کی گاڑی راستے میں کہیں مل جائے اور وہ اس طرح ردا کو روشن خان سے چھین لے۔

☆.........☆.........☆

خرم گاڑی پوری رفتار سے چلا رہا تھا۔ اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر تھا۔ خرم نے گاڑی چلاتے ہوئے سوچا کہ شاید اب تک اس کی اطلاع روشن خان کو مل چکی ہو اور اس نے اپنے آدمی شہر میں پھیلا دیئے ہوں گے۔ اس گاڑی میں مزید سفر جاری رکھنا ان کے لئے خطرناک تھا۔

اس نے کار کی رفتار آہستہ کر دی اور سوچنے لگا کہ کیا کرے۔ جب ردا نے دیکھا کہ کار کی رفتار آہستہ ہوگئی ہے تو اس نے دریافت کیا۔ "کیا ہوا؟"

"سوچ رہا ہوں کہ روشن خان کے آدمی اور ممکن ہے کہ پولیس اس گاڑی کی تلاش میں نکل کھڑی ہو۔" خرم نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ظاہر ہے کہ وہ ہمارا پیچھا تو کریں گے۔ ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو یہ شہر چھوڑ کر نکلنا ہوگا۔" ردا نے کہا۔

"اس کار میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" خرم بولا۔

ردا نے سوچا۔ "بات ٹھیک ہے۔"

"ہم اس کار کو کہیں چھوڑ دیتے ہیں۔" خرم نے کار کی رفتار مزید آہستہ کر دی۔ وہاں سے کچھ آگے کچا راستہ آرہا تھا جس کے اطراف میں جنگل تھا اور اس جنگل میں ناصر چھپا بیٹھا تھا جبکہ اس کے دوسری طرف ابھی تک پولیس موجود تھی۔

"اس سڑک پر گاڑی چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ میں یہ کار اس جنگل میں لے جاؤں۔ درختوں کے بیچ چھوڑوں گا تو آسانی سے کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔" خرم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"پھر جلدی کرو۔ کہیں وہ پہنچ نہ جائیں۔" ردا نے غیر ارادی طور پر پیچھے دیکھا۔

خرم نے کار اس کچی سڑک پر اتار لی اور دھول اڑاتا ہوا آگے تک لے گیا۔ کچھ آگے اسے راستہ دکھائی دیا۔ اس راستے سے وہ جنگل کے اندر جا سکتا تھا۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ کار کو درختوں کے درمیان کہیں چھوڑ کر فرار ہو جائے تاکہ کار پر آسانی سے کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

راستہ بنتا جا رہا تھا اور خرم کار بہت اندر تک لے گیا۔ اب مزید آگے کار کو لے جانا مشکل تھا۔ گھنے درختوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کار کا ان میں سے گزرنا محال تھا۔ خرم نے دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ "باہر نکلو۔"

دونوں باہر نکلے۔ اس جنگل میں سے کون سا راستہ کس طرف جاتا تھا، دونوں ہی اس سے لاعلم تھے۔

"کس طرف جانا ہے؟" ردا نے پوچھا۔

"بس چلنا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو یہ جنگل ختم ہو ہی جائے گا۔" خرم کہتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے ردا تھی۔

ابھی وہ دونوں کچھ ہی آگے گئے تھے کہ یکدم ٹھٹک کر رک گئے۔ ایک پولیس والا ہاتھ میں پستول لئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔

ناصر کے تعاقب میں پولیس کے سبھی اہلکار اس جنگل میں چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ انہیں سکندر کی طرف سے حکم ہی اتنا سخت ملا تھا کہ وہ پوری کوشش میں تھے کہ کسی طرح سے ناصر ان کی گرفت میں آجائے۔

پولیس کو اس جنگل میں دیکھ کر ردا گھبرا کر خرم کے پیچھے ہوگئی اور خرم سوچ رہا تھا کہ پولیس والا اچانک اس جنگل میں ان کے سامنے کیسے آگیا؟ کہیں ان کا تعاقب تو نہیں ہو رہا تھا اور ابھی کچھ پولیس والے اور بھی آجائیں گے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" پولیس والے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "جنگل میں لڑکی کو لئے پھر رہے ہو، معاملہ کیا ہے؟"

"ہم راستہ بھول گئے ہیں۔" خرم بولا۔

"راستہ بھی کہاں بھولے، جنگل میں؟ بڑی حیرت کی بات ہے۔ اس طرف آتا کوئی نہیں ہے اور تم دونوں اس طرف آکر راستہ بھول گئے۔" پولیس والا ہنسا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔

اس کا پستول ان دونوں کی طرف تھا اور نگاہیں کبھی موبائل اور کبھی ان دونوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ان کے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ خرم جست لگا کر بھی اس پولیس والے کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

ادھر پولیس والے نے نمبر ملا کر موبائل فون اپنے کان سے لگایا۔ بیل جانے لگی اور ادھر خرم اور ردا کے لئے ایک حیران کن بات ہوگئی۔

ناصر جو اسی جنگل میں چھپا ہوا تھا اور بڑی دیر سے اس پولیس والے کو دیکھ رہا تھا، وہ ہاتھ میں ایک موٹی ٹوٹی ہوئی شاخ پکڑے ایک طرف سے نمودار ہوا۔ خرم اور ردا اسے دیکھتے ہی متحیر رہ گئے۔

"ابھی بلاتا ہوں اپنے ساتھیوں کو۔" پولیس والے کی غلیظ نگاہ ردا پر تھی۔

اسی اثنا میں ناصر نے موٹی شاخ کا وار پولیس والے کے سر پر کیا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جا گرا، موبائل فون بھی زمین پر جا پڑا۔ ناصر نے اس پر مزید حملہ کیا اور پولیس والا بے ہوش ہو کر زمین پر ڈھے گیا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔ اپنے موبائل فون سے اس نے جس کا نمبر ملایا تھا، دوسری طرف سے فون آن ہوگیا تھا اور ہیلو...... ہیلو کی آوازیں آرہی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" خرم نے ناصر سے سوال کیا تو اس کی آواز فون سننے والے کے کان میں پڑ گئی۔ اس نے ہیلو...... ہیلو چلانا بند کر دیا اور باتیں سننے لگا۔

"مجھے تم دونوں کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔" ناصر نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے دونوں کو ششدر نگاہوں سے دیکھا۔

"پہلے یہاں سے نکلو۔ کہیں کوئی اور نہ آجائے۔" ردا نے مداخلت کی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ باتیں راستے میں بھی ہو سکتی ہیں۔" خرم نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور وہ ایک طرف چل پڑے۔

فون کی دوسری طرف پولیس والا ہی تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے باتیں سن کر فوراً اپنے دوسرے ساتھیوں کو فون کرنا شروع کر دیا۔

☆.........☆.........☆

درختوں کا جال جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ تینوں تقریباً بھاگتے ہوئے ایک سمت چلے جا رہے تھے۔ ان سے پیچھے اس جگہ، جہاں انہوں نے پولیس والے کے سر پر ڈنڈے مارے تھے۔ اس جگہ پولیس والے پہنچ گئے تھے۔ ایک سپاہی اپنے اس ساتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش میں لگ رہا تھا۔ وہ سرخ کار بھی انہوں نے دیکھ لی تھی اور اس کی اطلاع سکندر کو کر دی گئی تھی۔

سکندر پولیس والا تھا۔ اس نے فوراً تانا بانا بنا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان دونوں سے ملنے والا ناصر ہی ہے۔ اور اب وہ تین ہوگئے ہیں اور تینوں ایک سمت بھاگے ہیں۔ سکندر نے اگلا حکم دیا۔ "ایک اس بے ہوش آدمی کے پاس رک جائے اور باقی لوگ ان لوگوں کا تعاقب کریں۔ ابھی میرے کچھ اور آدمی بھی اس جگہ پہنچتے ہیں۔"

"بہتر سر۔"

"کوئی کوتاہی میں برداشت نہیں کروں گا۔" سکندر نے کہہ کر فون اکبر کو ملایا۔

"جی سر میں اس کار کی تلاش میں ہوں اور ناکہ بندی کرا دی ہے۔" اکبر نے فون سنتے بتایا۔

"جہاں ہم نے ناصر کو مارنا چاہا تھا وہاں چلے جاؤ۔ گاڑی وہاں موجود ہے اور وہ اس وقت اس جنگل میں ہیں۔ جلدی کرو اور انہیں پکڑو۔ ایک بات اور یاد رکھو۔ اس لڑکی کے ساتھ اب دو لڑکے ہیں۔ دونوں کو جنگل میں مار دینا اور لڑکی کو محفوظ جگہ پہنچا دینا۔" سکندر نے جلدی سے کہا۔

"اوکے سر۔"

"جلدی جاؤ۔" سکندر چلایا۔

"میں نے گاڑی کا رخ موڑ لیا ہے سر۔" اکبر نے اسی وقت اپنی کار کا اسٹیئرنگ گھمایا اور یہ پروا کئے بغیر کہ وہ سڑک کی مخالف سمت جا رہا ہے اور سامنے سے آتی ہوئی گاڑی سے حادثہ بھی ہو سکتا ہے، وہ کار دوڑائے جا رہا تھا۔ کئی بار گاڑی ٹکراتے بچی، آگے یوٹرن آیا تو اس نے اپنی گاڑی موڑ کر دوسری سڑک پر ڈال دی۔

اس کی گاڑی میں سادہ لباس میں پولیس اہلکار بیٹھے ہوئے تھے۔ اکبر بھی اس وقت وردی میں نہیں تھا۔ اس کی گاڑی سڑک پر تیر کی طرح جا رہی تھی۔ پھر جنگل شروع ہوگیا اور اس نے کار کچے پر ڈال دی۔ دھول کے بادل نے اس کی گاڑی غائب کر دی۔ آگے جا کر اس نے گاڑی کو بریک لگایا۔ اس کے فون کی اسکرین پر سکندر نے اس اہلکار کا فون نمبر بھیج دیا تھا جو اس وقت وہاں موجود تھا۔ اکبر نے اسے فون ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "اکبر بول رہا ہوں۔ کہاں ہو تم؟"

"آپ کہاں کھڑے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں کچے پر کھڑا ہوں۔" اکبر نے جواب دیا۔

"میں ابھی آپ کو لینے آتا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اکبر گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد جو پولیس والا زخمی پولیس والے کے پاس موجود تھا، وہ درختوں میں سے نمودار ہوا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اس راستے سے گاڑی اندر جا سکتی تھی۔ اکبر اس کے پیچھے اپنی گاڑی وہاں تک لے گیا جہاں خرم نے سرخ کار کھڑی کی تھی۔ گاڑی مزید آگے نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے گاڑی اسی جگہ کھڑی کی اور وہ سبھی باہر نکل آئے۔

اکبر نے غور سے اس سرخ کار کو دیکھا اور پھر اس سے پوچھا۔ "کس طرف گئے ہیں وہ؟"

"جسے انہوں نے مارا تھا، وہ ہوش میں آچکا ہے۔ یہ نہیں پتا چل سکا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کس طرف جا سکتے ہیں؟" اکبر نے کہا۔

وہ اہلکار بولا۔ "اس جنگل سے نکلنے کا دوسرا راستہ جنوب کی طرف ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی طرف گئے ہوں گے۔ میرے آدمی اسی طرف گئے ہیں۔"

"ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔" اکبر کہہ کر اسی طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے اس کے آدمی بھی تھے۔

وہ سب بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ اب ان کے ہاتھ میں ریوالور بھی دکھائی دے رہے تھے۔

☆.........☆.........☆

وہ تینوں بھاگ رہے تھے۔ ردا کی سانس پھول گئی تھی اور اس سے مزید بھاگنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں بیٹھ کر اپنی سانس بحال کرے اور پھر آگے کا سفر جاری رکھے۔

"کیا ہم رک نہیں سکتے۔" ردا پھولی سانس کے ساتھ بولی۔

"اگر رک گئے تو وہ ہمارے سر پر پہنچ جائیں گے۔" خرم بولا۔

"اس جنگل میں سکندر کی پولیس پھیلی ہوئی ہے۔ ہوشیار رہنا۔" ناصر نے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے تھے اور ادھر کیسے پہنچے؟" خرم نے پوچھا۔

"مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ ورنہ میں اس جنگل میں لاش کی طرح پڑا رہتا۔" ناصر بولا۔

"ہوا کیا تھا؟"

بھاگتے ہوئے ناصر نے اختصار سے سب بتا دیا۔ اس کی باتیں خرم اور ردا سن رہے تھے۔ جونہی ناصر کی بات ختم ہوئی، ردا کے لئے مزید بھاگنا ممکن نہیں رہا اور وہ اسی جگہ رک گئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ناصر اور خرم کو بھی رکنا پڑا۔

اس وقت بھی وہ درختوں کے بیچ کھڑے تھے۔ سورج کی روشنی شاخوں سے اپنی جگہ بنا کر نیچے اتر رہی تھی اور کہیں بالکل اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔

"زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہمارے تعاقب میں ہوں گے۔" ناصر کی نگاہیں دور تک دوڑ رہی تھیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" خرم نے ردا کی طرف دیکھا۔

ردا کچھ دیر رکی رہی اور پھر چل پڑی۔ "یہ جنگل کب ختم ہوگا؟"

"معلوم نہیں۔" خرم نے جواب دیا۔

"ہمیں تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ہم جا کس طرف رہے ہیں؟" ناصر بولا۔

اچانک تینوں کے قدم یکدم جم گئے۔ جنگل کے سناٹے میں کہیں گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ تینوں نے متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

"گولی چلی ہے۔" خرم نے سرگوشی کی۔

"تیزی سے نکلو یہاں سے۔" ناصر بولا۔

تینوں نے ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ اب ان کے بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ردا دونوں سے پیچھے تھی لیکن ناصر اور خرم بھاگتے ہوئے بار بار اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور جونہی ان کے درمیان کچھ فاصلہ بڑھ جاتا تو ناصر اور خرم اپنی رفتار آہستہ کر دیتے تھے۔

ردا کی سانس پھر پھول گئی تھی۔ اس کے لئے بھاگنا ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن اسے بھاگنا تھا۔ بھاگنے میں ہی اس کی سلامتی تھی۔

اچانک انہیں سامنے ایک سڑک دکھائی دی۔ سڑک کی دوسری طرف نہر تھی اور سڑک پر ٹریفک بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ سڑک آگئی۔" خرم بولا۔

سڑک کو دیکھ کر ردا کے اندر جوش بھر گیا اور اس نے مزید ہمت سے بھاگنا شروع کر دیا۔ درخت پیچھے رہ گئے تھے اور وہ سڑک کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ سڑک بہت طویل تھی۔ اس سڑک کے ساتھ نہر بھی تھی۔

دائیں بائیں سے گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ خرم نے آگے بڑھ کر دور سے آتی ہوئی ایک کار کو ہاتھ کا اشارہ دیا تاکہ وہ رک جائے۔

کار بڑی دھیمی رفتار سے آرہی تھی۔ اس کار کے اندر ایک ہی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی مونچھیں گھنی اور بڑھی ہوئی شیو تھی۔ اس نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ کار کے اندر دھیمی آواز میں موسیقی چل رہی تھی۔

اس شخص نے دور سے ہی دونوں لڑکوں کے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ اور پھر جیسے جیسے اس کی کار ان کے قریب آنے لگی، اس شخص کی نظریں ردا پر جم گئیں۔ اس شخص نے کار روک لی۔ تینوں اس کی طرف بڑھے۔

"کیا آپ ہمیں لفٹ دے سکتے ہیں؟" خرم نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس شخص نے پہلی بار ردا سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" خرم کی سمجھ میں جب یہ بات نہ آئی کہ اسے کہاں جانے کا بتائے تو خرم نے سوال کر دیا۔

وہ مسکرایا۔ "جہاں میں جاؤں گا وہاں جانا ہے۔"

"ہمیں کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچا دیں۔ ہم دراصل کار رینٹ پر لینا چاہتے ہیں۔" ناصر بولا۔

"یہ کار بھی رینٹ پر چلتی ہے۔ مجھے بتاؤ کہاں جانا ہے۔ میں لے چلتا ہوں۔" اس شخص کی نگاہیں پھر ردا پر مرکوز ہوگئیں۔

"ہم نے کراچی جانا ہے۔ ہمیں ریلوے اسٹیشن چھوڑ دیں۔" اس بار ردا بولی۔

ردا کی بات سن کر اس نے اس کا چہرہ دیکھا اور مسکرا کر ردا سے ہی کہا۔ "بیٹھ جائیں۔ دو ہزار کرایہ لوں گا۔"

"چلو۔" خرم کہتا ہوا ڈرائیور کے برابر جبکہ ناصر اور ردا پیچھے بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں ناصر نے دیکھا کہ وہ لوگ بھی جنگل سے باہر نکل آئے تھے۔ اور انہوں نے انہیں کار میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اتنی دور سے وہ کار کا نمبر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اکبر وہیں سے چلایا۔ "رک جاؤ...... رک جاؤ۔"

"یہ کون ہے؟" ڈرائیور نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھنا چاہا لیکن خرم نے اپنے ہاتھ سے ان کی گردن مڑنے نہیں دی اور بولا۔ "جلدی نکلو۔ یہ ڈاکو ہیں۔ ہماری گاڑی چھینی ہے انہوں نے۔ ان کے ہاتھ میں اسلحہ ہے۔"

اسی وقت اکبر نے ایک ہوائی فائر کیا۔ "رک جاؤ۔"

وہ سبھی کار کی طرف اندھا دھند دوڑے آرہے تھے۔ ڈرائیور نے گردن گھما کر اس جانب دیکھا۔ جونہی اس کی نگاہ اکبر کے چہرے پر پڑی، وہ دل ہی دل میں بولا۔ "یہ تو اکبر ہے۔"

"چلو جلدی نکلو۔" ناصر چلایا۔

ڈرائیور نے کار گیئر میں ڈالی اور آگے بڑھا دی۔ وہ سب پیچھے بھاگے آرہے تھے۔ ڈرائیور نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ اسی اثنا میں اکبر نے یکے بعد دیگرے کار پر فائر کھول دیے۔ کوئی فائر کار کو چھو نہیں سکا۔ ڈرائیور اس جگہ سے کار بڑی تیزی سے نکال کر لے گیا۔

اس ڈرائیور کا نام طفیل تھا۔ کسی زمانے میں طفیل کا اپنے علاقے میں طوطی بولتا تھا۔ وہ کئی بار مختلف جرائم میں جیل بھی جا چکا تھا۔ لڑائی، مار کٹائی اس کا معمول کا کام تھا۔ اکبر جس پولیس اسٹیشن میں تھا، وہ طفیل کے علاقے میں تھا۔ کئی بار تھانے میں طفیل کے آنے سے دونوں کی اچھی جان پہچان ہوگئی تھی۔ اور پھر طفیل باقاعدہ اکبر کی خدمت بھی کرنے لگا تھا، جس سے یہ قربت مزید بڑھ گئی تھی۔

جب طفیل کچھ زیادہ ہی اندر باہر جانے لگا تو اس نے ایک فیصلہ کیا اور جرائم چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ وہ چند ماہ بالکل گمنام ہوگیا۔ اور پھر اس نے علاقہ بھی بدل لیا۔ جب پولیس کا اس کی طرف سے دھیان ہٹ گیا تو اس نے اپنی سرگرمیاں پھر شروع کر دیں۔ اب اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ اس نے رینٹ اے کار کا آفس اور کباڑ مارکیٹ میں کباڑ کا کاروبار کر لیا تھا جبکہ جرائم اس کے آدمی کرتے تھے۔

طفیل کار بہت آگے لے گیا تھا۔ پھر اس نے کار کی رفتار کچھ کم کر دی۔ اور اپنے برابر بیٹھے ہوئے خرم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں اس آدمی کو جانتا ہوں۔ یہ پولیس والا ہے۔ ان کا ایک گروپ ہے۔ بڑے ظالم اور سخت دل لوگ ہیں۔ اگر کہا جائے تو یہ بات ٹھیک ہوگی کہ یہ دھرتی پر بوجھ ہیں۔ یہ آپ لوگوں کے پیچھے کیوں تھے؟"

"تم ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچا دو بس۔" خرم اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ میں آپ لوگوں کی کچھ مدد کر سکوں۔" اس نے کہا۔

"ہمیں مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" خرم خشک لہجے میں بولا۔

"اس کے بغیر آپ لوگوں کا چارہ بھی نہیں ہے۔" اس کا انداز بڑا معنی خیز تھا۔ وہ تینوں اس کی بات سن کر چونکے۔

"کیا مطلب؟" خرم نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"یہ لوگ جس کے پیچھے پڑ جائیں، موت تک اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ ان کے باس سکندر کے سینے میں تو دل ہی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ جلد بازی میں فیصلہ کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن جا رہے ہو۔ پکڑے جاؤ گے۔" وہ بولا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، کھل کر بات کرو۔" ناصر نے کہا۔

"میں تم لوگوں کو محفوظ جگہ دے سکتا ہوں۔ جہاں تم چند دن رک کر اطمینان سے سوچ سکتے ہو۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے کہ تم لوگوں کا مسئلہ کیا ہے۔ مجھے پیسے سے غرض ہے۔ میں تم تینوں کو محفوظ جگہ دوں گا اور اس کا معاوضہ لوں گا۔ اور اس شہر سے جس طرف جانا چاہتے ہو محفوظ طریقے سے لے بھی جاؤں گا۔"

اس کی بات سن کر وہ تینوں سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ (جاری ہے)

محمد فاروق انجم

قسط : 5

سکندر کو روشن خان کی یہ بات جیسے کھا گئی۔ روشن خان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اسے اشاروں میں ”خواجہ سرا“ کہہ رہا ہو۔ روشن خان یہ کہہ کر غصے سے باہر چلا گیا۔ اس نے ایک نظر سکندر کی طرف دیکھ کر یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کے چہرے پر کیا رنگ آرہا ہے۔

روشن خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل پر پہنچ گیا۔ پھر یکدم اسے کچھ یاد آیا اور اس نے واپس سکندر کے کمرے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

سکندر کے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لئے اس نے جونہی ہاتھ بڑھایا، اس کا ہاتھ فوراً رک گیا۔ روشن خان جاتے ہوئے جتنا دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا، اتنا کھلا ہوا تھا اور اندر سے سکندر کی آواز آرہی تھی۔

سکندر فون پر بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا ”جیسے بھی ہو ان کا پیچھا کرو۔ زمین کے اندر سے کھود کر انہیں نکالو۔ کچھ بھی کرو انہیں پکڑو۔ تم بتا رہے ہو کہ اس لڑکی کے ساتھ دو لڑکے ہیں۔ انہیں پکڑتے ہی دونوں لڑکوں کو اسی جگہ مار دینا اور لڑکی کو خراش تک نہیں آنی چاہئے۔ لڑکی کو محفوظ مقام پر پہنچا دینا۔ روشن خان کو میں ٹرخاتا رہوں گا۔ تم میری بات سمجھ گئے ہو نا؟...... اوکے۔“

سکندر نے فون بند کر دیا۔ روشن خان دروازے پر کھڑا اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے سامنے اب بات واضح ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سکندر بھی اس سے دھوکا کر رہا ہے۔ وہ ان لڑکوں کو مار کر ردا کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ گویا سکندر کی نیت خراب ہو چکی ہے؟

روشن خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چاہتا تو اندر جا کر سکندر کا گلا دبا دیتا۔ کیونکہ اس وقت سکندر اکیلا تھا۔ لیکن اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

اپنی گاڑی تک آتے آتے ہوئے روشن خان سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ تیسرا کون ہے؟ کیا ناصر ہے؟ ناصر کیسے مل گیا؟ کہیں سکندر نے جان بوجھ کر ناصر کو تو نہیں چھوڑ دیا اور خود سانپ کے ڈسنے کا بہانہ کر کے بیڈ پر لیٹ گیا ہو؟ اگر یہ سچ ہے تو سکندر نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے پیچھے اس کی کیا سازش ہو سکتی ہے؟

ایسے کئی سوالوں کا بوجھ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہا۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ اس بات کے سوا کوئی بات واضح نہیں تھی کہ سکندر کی ردا کے معاملے میں نیت خراب ہو چکی ہے اور وہ اسے تلاش کر کے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔

سکندر اگر پولیس والا تھا اور اس کے سینے میں پتھر کا دل تھا تو روشن خان کا بھی گوشت کا لوتھڑا نہیں تھا۔ سخت دلی میں وہ بھی سکندر سے پیچھے نہیں تھا۔ اس نے پہلے تو اپنے ایک آدمی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اس کے ملازم ناصر اور خرم اسے دھوکا دے کر فرار ہو گئے ہیں۔ اپنے آدمی پھیلا دو اور انہیں تلاش کرو۔

روشن خان نے جس کے ذمے یہ کام لگایا تھا، وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ ناصر اور خرم کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ روشن خان کا وہ وفادار تھا۔ وہ اس کے لئے کوئی کام بھی کر سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ روشن خان کے حکم کی تکمیل تک وہ چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ کام کرنے کا اس کا اپنا ہی انداز تھا۔ وہ بہت شاطر اور زیرک تھا۔

اس نے روشن خان سے ان کے بارے میں تفصیل معلوم کی۔ روشن خان نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ان کی کار کہاں ملی تھی۔ اس آدمی نے اسی جگہ سے ان کو تلاش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

روشن خان کا خیال تھا کہ جب اس کا آدمی ناصر اور خرم کو ڈھونڈ لے گا تو ردا خود بخود مل جائے گی۔ روشن خان اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ سکندر کو کیسے سبق سکھایا جائے۔

☆......☆......☆

ان تینوں کے سامنے کھانا موجود تھا۔ گرم روٹیاں، مرغی کا سالن، سلاد اور کولڈ ڈرنک کی بڑی بوتل۔

خرم، ناصر اور ردا کھانے کے سامنے براجمان تھے۔ تینوں کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ کہیں طفیل نے کھانے میں کوئی چیز نہ ملا دی ہو، جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو جائیں۔

طفیل کچھ فاصلے پر بیٹھا تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زمانہ ساز آدمی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈالا اور روٹی لے کر پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

وہ روٹی کھانے لگا۔ جب اس نے آدھی روٹی کھالی تو اس نے کہا۔ ”میں ایسا دھوکے باز نہیں ہوں کہ کھانے کی چیز میں کوئی چیز ڈال کر تم تینوں کو بے ہوش کر کے لوٹ لوں۔ میں ایسا نہیں، دیکھو میں بھی کھا رہا ہوں تم لوگ بھی کھاؤ۔“

طفیل کی بات سن کر تینوں نے کھانا شروع کر دیا۔ ناصر اور خرم سوچ رہے تھے کہ طفیل ضرورت سے بھی زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ چہروں کو پڑھنے کا بھی فن جانتا ہے۔

تینوں کو بھوک لگی تھی۔ تینوں مزے سے کھانا کھانے لگے۔ طفیل نے اپنا کھانا ختم کیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”ہم کیا سوچ رہے تھے، اس نے جان لیا تھا۔“ خرم نے آہستہ سے کہا۔

”ابھی چپ رہو، کوئی بات نہ کرو۔“ ناصر نے سرگوشی میں کہا۔ تینوں چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔

طفیل اوپر چھت پر چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور ایک نمبر تلاش کرنے کے بعد اسے ملا دیا۔ موبائل فون کان کو لگانے کے بعد وہ دوسری طرف سے فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ”ہیلو کون؟“

”آپ کا خادم بول رہا ہوں۔“ طفیل نے مسکراتے ہوئے بڑے انداز سے کہا۔

”کون خادم؟“ دوسری طرف سے بارعب لہجے میں پوچھا گیا۔

”بھول گئے آپ اکبر صاحب۔ میں طفیل بات کر رہا ہوں۔“ طفیل نے اپنا نام بتایا۔

دوسری طرف سے اکبر نے کچھ سوچا۔ پھر بولا ”وہی طفیل جواب طفیل کباڑیہ ہو گیا ہے؟“

”ارے کیا خوب پہچانا حضور نے۔“ طفیل ہنسا۔

”کہو کیا بات ہے۔ کیوں فون کیا۔“ اکبر نے پوچھا۔

”کچھ کباڑ کا سامان ہے میرے پاس۔ آپ جانتے ہیں کہ کباڑ کو بلیک گولڈ کہتے ہیں۔ ہوتا تو یہ کباڑ ہے لیکن ضرورت پڑنے پر سونے سے زیادہ مہنگا بک جایا کرتا ہے۔“ طفیل ٹہلتے ہوئے بولا۔

”کھل کر بات کرو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں نے آپ کو دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ صاحب کیا وہ قیمتی لوگ ہیں۔“

”تم نے کہاں دیکھا تھا؟“

”اس بات کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ اگر وہ آپ کی ضرورت کی چیزیں ہیں اور ان کی وجہ سے مشینری رکی ہوئی ہے تو وہ چیزیں میرے کباڑ میں موجود ہیں۔ آیئے اور لے جایئے۔“ طفیل کہہ کر مسکرایا۔

”تمہارے پاس ہیں؟ کہاں ہو تم؟ میں ابھی آتا ہوں۔“ اکبر بے چین ہو گیا۔

”ضرور آیئے۔ لیکن خالی ہاتھ نہ آیئے گا۔ کباڑ میں کوئی چیز مفت نہیں بکتی۔“ طفیل نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم ان کی قیمت وصول کرو گے۔“ اکبر فوراً سمجھ گیا۔

”کوئی ایسی چیز ہے جس کا مول نہ ہو؟ اس دنیا میں ہر چیز اپنی ایک قیمت رکھتی ہے۔“ طفیل فلسفی ہو گیا۔ اس نے فلسفہ بگھارا۔

”تم جانتے ہو کہ کس سے بات کر رہے ہو؟“ اکبر نے اپنی وردی کا رعب جھاڑا۔

”میرے لئے وردی والا اور عام آدمی برابر ہے۔ ڈرا سے ہو گا جس نے جرم کیا ہو گا۔ میں ایک شریف شہری ہوں۔“ طفیل نے اس کا رعب ہوا میں اُڑا دیا۔

اکبر تلملایا۔ ”مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں تمہارے پاس آتا ہوں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”پہلے اپنے بڑوں سے بات کر لیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکوں کی قیمت آپ سے ایک لاکھ روپیہ لوں گا۔ منظور ہو تو مجھے کال کر لینا۔“ طفیل بولا۔

”طفیل تم آپے سے باہر ہو رہے ہو۔“

”ایسا نہیں ہے جناب۔ میں کاروبار کر رہا ہوں۔“

”یہ کیسا کاروبار ہے؟“

”یہ ویسا ہی کاروبار جب ایک پولیس والا پیسے لے کر بندے کو اندر یا باہر کر دیتا ہے؟“ طفیل بولا۔

اکبر اس کی بات سن کر بے بس سا ہو گیا۔ غصہ اس کی آنکھوں میں خون کی صورت اترا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی بجائے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

اکبر نے اسی وقت فون سکندر کو کیا اور ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ سکندر نے ایک ایک بات غور سے سنی اور پھر بولا ”اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ واپس چلے جائیں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں اس وقت جنگل سے آگے سڑک پر ایک چائے کا ہوٹل ہے، وہاں ہوں۔“ اکبر نے بتایا۔

”تم میرا انتظار کرو، میں پہنچ رہا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔

”سر آپ اس حالت میں آجائیں گے۔“ اکبر نے پوچھا۔

”مرد ہوں۔ سانپ کے ڈسنے کی تکلیف ختم ہو چکی ہے۔ میرا انتظار کرو، میں آرہا ہوں۔“ سکندر نے فون بند کیا اور اپنے اہلکار کا سہارا لے کر بیڈ سے اٹھا، جوتے پہنے اور لنگڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد اس کی گاڑی بڑی رفتار سے مطلوبہ ہوٹل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ سکندر نے اس ہوٹل میں کئی بار چائے پی تھی۔

سکندر کی گاڑی جب وہاں پہنچی تو اکبر اپنی جگہ سے اٹھ کر سکندر کی کار کی طرف تیزی سے آیا۔ سکندر نے اسے کار میں بیٹھنے کو کہا۔ وہ کار میں بیٹھ گیا۔

”اسے فون ملاؤ اور کہو کے میرے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے۔ بتاؤ ہم کہاں آئیں؟“

اکبر نے فون ملایا اور اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد رابطہ ہو گیا۔ اکبر بولا ”طفیل کہاں ہو تم؟“

”حکم میرے سرکار۔“ طفیل کی آواز آئی۔

”میرے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے، بتاؤ کہاں آؤں۔“ اکبر بولا۔

”آپ نے ایک لاکھ روپیہ منگوا بھی لیا؟ حیرت ہے۔“

”وقت ضائع مت کرو اور بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟“ اکبر اکتاہٹ سے بولا۔

”میں شہر سے نکل آیا ہوں۔ مجھے ایک جگہ سے کباڑ خریدنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ مجھے بتائیں گے ابھی۔“ طفیل چالاک آدمی تھا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس والوں کے ساتھ ٹکر لے رہا ہے اور وہ بھی ان کے ساتھ جو انسان کے روپ میں بھیڑیے ہیں۔

”کہاں جا رہے ہو تم اس وقت؟“ اکبر نے تیز لہجے میں کہا۔ ”پہلے مجھ سے بات کی اور اب کہیں جا رہے ہو۔ تمہارے پاس وہ لوگ ہیں بھی کہ نہیں یا ہمیں دھوکا دے رہے ہو؟“

”میں اپنے کام میں دھوکا نہیں کیا کرتا۔ کھری بات کرتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی مجھ سے رابطہ کر لیں گے ورنہ میں کہیں نہ جاتا۔“ طفیل بولا۔

”اب کیا کرنا ہے بولو؟“

”دو ڈھائی گھنٹے انتظار کر لیں۔ میں فارغ ہوتے ہی آپ کو فون کرتا ہوں۔“ طفیل نے سوچ کر کہا۔

کچھ کہنے سے قبل اکبر نے سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر نے اشارہ کیا تو اکبر بولا۔ ”ٹھیک ہے ہم انتظار کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ وہ تینوں امانت ہیں تمہارے پاس۔“ اکبر کا لہجہ عجیب اور خوفناک ہو گیا تھا۔

طفیل نے گہری سانس لی اور بولا ”بے فکر رہیں۔“

رابطہ منقطع ہو گیا۔ سکندر نے دانت پیس کر کہا۔ ”کمینہ کہیں نہیں جا رہا بلکہ ہمیں چکر دے رہا ہے تاکہ وہ اپنا تحفظ کر سکے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیا خیال ہے اسے خود تلاش نہ کریں؟“ اکبر نے خیال پیش کیا۔

”ابھی تم اس کے فون کا انتظار کرو۔ پھر اسے زمین سے بھی نکالنا پڑا تو نکال کر لے آئیں گے۔“ سکندر وحشت ناک انداز میں بولا۔

☆......☆......☆

طفیل نے مسکرا کر اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا اور پھر خوش ہو کے موبائل فون کو چوما اور اپنے آپ سے بولا ”لکشمی آرہی ہے۔ تیری بھی کیا قسمت ہے طفیل۔ کار چوری کر کے کیا مل رہا تھا۔ لاکھ روپے کا کباڑ ہاتھ لگ گیا۔“

طفیل اس وقت ایک ڈرم کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک موٹر سائیکل سوار اس کے پاس آکر رکا۔

روشن خان نے اپنے جس آدمی کو ردا اور خرم کی تلاش پر لگایا تھا، اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے آدمی تلاش میں دوڑا دیئے تھے اور وہ پوچھ گچھ کر کے ایک دوسرے کو باخبر کر رہے تھے۔ وہ آدمی بھی اسی سلسلے میں طفیل کے پاس آیا تھا۔

”آؤ کیا حال ہے۔“ طفیل نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے اسلم بھائی نے بھیجا ہے۔“ آنے والے نے بتایا۔

”خیریت تو ہے؟“ طفیل نے پوچھا۔

”کچھ لوگوں کی تلاش ہے۔ اسلم بھائی کے قریبی دوست کو دھوکا دے کر بھاگ گئے ہیں۔ سنا ہے کہ لاکھوں روپیہ لے کر فرار ہوئے ہیں۔“ اس نے آخری جملہ اپنی طرف سے شامل کر دیا۔

”اچھا۔“ طفیل نے غور سے اسے دیکھا۔

”ان کی تلاش کی ذمہ داری اپنے اسلم بھائی کے سپرد ہے۔ ویسے بھی وہ ان کے دوست ہیں۔ ہر حال میں یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔“

”میرے لئے کیا حکم لائے ہو؟“

”اسلم بھائی نے آپ کے لئے پیغام بھیجا ہے کہ دائیں بائیں نظر رکھیں۔“ وہ بولا۔

”کیسے نظر رکھوں۔ میں کون سا انہیں جانتا ہوں یا انہیں دیکھا ہے۔“ طفیل نے کہا۔

”بس یہ بتایا ہے کہ ایک لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک یا دو لڑکے ہیں۔“ اس نے بتایا

”کیا کہا؟“ طفیل یکدم چونکا۔

”ایک لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ یا دو لڑکے ہیں۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

طفیل سوچ میں پڑ گیا کہ ایک لڑکی اور دو لڑکے اس کے پاس بھی ہیں۔ پولیس وان کی تلاش ہے۔ طفیل نے پوچھا۔ ”ان کی تلاش کے لئے پولیس بھی پیچھے لگی ہے۔“

”سنا ہے کہ پولیس انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اب مجھے زیادہ پتا نہیں ہے۔ تم نظر رکھنا۔ بلکہ اسلم بھائی نے کہا ہے کہ تم بھی اپنے آدمی دائیں بائیں پھیلا دو۔“ اس نے کہا اور موٹر سائیکل کو کک ماری۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں۔“ طفیل بولا۔

”چلتا ہوں۔“

”ایک منٹ سنو۔ مجھے اسلم بھائی کا نمبر دے دو۔ اگر کوئی ملا تو اطلاع کر دوں گا۔“ طفیل نے اپنا موبائل فون نکالا اور اسلم بھائی کا نمبر سیو کر لیا۔ وہ آدمی چلا گیا۔ اور طفیل سوچنے لگا کہ یہ تینوں تو بڑے قیمتی ہیں۔ اسے خیال آیا کہ ایک لڑکے نے اپنے جیب سے پانچ پانچ ہزار کے نوٹ نکالے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس اچھے خاصے روپے ہیں۔

طفیل زیر لب بڑبڑایا۔ ”تیرے ہاتھ سونے کی چڑیا لگی ہے اور تو اسے مٹی کے بھاؤ دینے کو تیار ہے۔ بے وقوفی مت کر اور پہلے یہ دیکھ کہ ان کے پاس پیسہ کتنا ہے۔“

طفیل ڈرم سے اٹھا اور اپنی ایک انگلی منہ میں ڈال کر اس نے سیٹی بجائی اور ایک آدمی بھاگتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”حکم۔“

اپنے سامنے کھڑے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے طفیل اپنا کان کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس نے اپنی ایک آنکھ بند کر لی۔ پھر وہ بولا۔ ”کچھ نہیں ابھی جا۔ مجھے سوچنے دے۔“

☆......☆......☆

وہ جگہ ایسی تھی کہ باہر کی طرف کوئی کھڑکی نہیں تھی جس سے باہر دیکھا جا سکے۔ جو بھی کھڑکیاں تھیں، وہ پیچھے کی طرف تھیں۔ اس طرف دوسرے گوداموں کی اونچی نیچی دیواریں تھیں جس سے کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

خرم اور ناصر نے پوری کوشش کر لی تھی۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکے تھے۔ ردا ایک طرف بیٹھی دونوں کو دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر کوئی پریشانی اور خوف نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خرم کی طرف سے اسے بہت حوصلہ ملا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی کمزور لڑکی نہیں تھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ رات ہوتے ہی ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔“ خرم نے ناصر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی۔

”طفیل نے ہم سے کہا تھا کہ ہم جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ کیوں نہ اسے کہیں کہ وہ ہمیں لے جائے۔“ ناصر بولا۔

”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی ایمانداری کا ابھی پتا چل جائے گا۔ اگر اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہ ہوا تو وہ ہمیں لے جائے گا اور اگر اس کے دل میں کوئی بات ہوئی تو وہ کوئی بہانہ کر دے گا۔“

”اور اگر اس نے کوئی بہانہ کیا تو پھر ہم رات ہوتے ہی ہر حال میں فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔“ ناصر نے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اسے بلاتا ہوں اور اسی بہانے نیچے کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“ خرم دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلا اور ایک ایک کر کے سیڑھی اترنے لگا۔ نیچے گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک طرف چلنے لگا تو ایک گدھا گاڑی گلی میں داخل ہوئی۔

اس گدھا گاڑی پر اونچائی تک پلاسٹک کے ڈرم ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھے ہوئے تھے۔ وہ گدھا گاڑی ایک گودام کے سامنے رک گئی۔ گدھا گاڑی چلانے والے دو تھے۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے بولا۔ ”جلدی سے گودام کی چابی لے کر آؤ۔“

دوسرا اس کا حکم سنتے ہی ایک طرف چل پڑا۔ خرم نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس گدھا گاڑی والے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”تم کب سے یہ کام کر رہے ہو؟“

”بچپن سے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کباڑ کی یہ بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ تم تو یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو گے۔“

”اس علاقے کا کوئی کونا مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“ اس نے فخر سے کہا۔

”یہ گلی کس طرف جاتی ہے؟“ خرم نے اس طرف اشارہ کر کے پوچھا، جس کی مخالف سمت سے وہ اس گلی میں داخل ہوئے تھے۔

”یہ گلی آگے جا کر دائیں مڑ جاتی ہے۔“ گدھا گاڑی والے نے خشک لہجے میں جواب دیا جیسے وہ چاہتا ہو کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔ لیکن خرم اس راستے پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کی سرد مہری کی پروا کئے بغیر اگلا سوال کر دیا۔

”یہ راستے جاتے کس طرف ہیں؟“

”راستوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس شہر کی یہ سب سے بڑی کباڑ مارکیٹ ہے۔ بندہ اس مارکیٹ کی گلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ کون سی گلی کس طرف اور کہاں نکلتی ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔“

اس نے بتایا اور اسی اثناء میں اس کا ساتھی گودام کی چابی لے آیا، وہ اس کے ساتھ گودام کی طرف چلا گیا۔

خرم نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ ان کے لئے یہ بہترین موقع ہے کہ وہ فرار ہو جائیں۔ اس مارکیٹ کی گلیوں میں وہ گم ہو کر کہیں نہ کہیں نکل ہی جائیں گے۔

خرم نے سوچتے ہی اوپر کی طرف دوڑ لگا دی اور اندر جا کر بولا۔ ”چلو نکلو۔ باہر کوئی نہیں ہے۔ ہم جا سکتے ہیں۔“

”اس کے آدمی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گے۔“ ناصر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اگر یہی سوچتے رہے تو ہمارے لئے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ ہمارا خیال ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی آدمی ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی گینگ ہو۔“ خرم نے کہا۔

”ہمیں ان باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔“ ردا کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جونہی خرم نے دروازہ کھولا، وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے طفیل سینے پر اپنے دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ خرم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کہاں جانا ہے؟“ وہ بولا۔

”میں تمہارے پاس ہی جا رہا تھا کہ تم ہمیں اب ریلوے اسٹیشن چھوڑ آؤ۔“ خرم نے کہا۔

”جانے کا ارادہ ہو گیا کیا؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں۔“

”تم لوگ کون ہو؟“ طفیل نے خرم سے نظریں بچا کر اس کے پیچھے کھڑی ردا اور ناصر کی طرف دیکھا۔

”ہم نکلنا چاہتے ہیں۔“ خرم نے کہا

”ویسے معاملہ کیا ہے کہ تم لوگوں کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے؟“ طفیل کے اس سوال نے تینوں کو مبہوت کر دیا۔ انہیں طفیل سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔

ناصر آگے بڑھا۔ ”تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو، یہ ہمارا معاملہ ہے۔ تم ہمیں چھوڑ آؤ، ہمیں جانا ہے۔“

”میں تو ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔ آپ تیار ہو جائیں۔“ طفیل نے باری باری تینوں کی طرف دیکھا اور پھر سیڑھیاں اتر گیا۔

خرم نے گردن گھما کر دونوں کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”یہ تقریباً چالیس لاکھ روپے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ میری تلاشی لیں گے۔ اس کا کیا بندوبست کریں؟“

تینوں سوچنے لگے۔ ردا کی حیران نگاہیں نوٹوں پر تھیں۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں نے چالیس لاکھ روپے کی رقم کو مختصر کر دیا تھا۔ اچانک ناصر نے اپنی شرٹ کا بٹن توڑا اور بولا۔ ”اس بٹن کو ٹانکنے کے لئے سوئی دھاگہ چاہئے۔“

”سوئی دھاگہ کہاں سے لائیں۔ تم نے اسے توڑا ہی کیوں۔“ خرم کو ناصر کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”تم نیچے جاؤ اور طفیل سے کہو کہ بٹن ٹوٹ گیا ہے، وہ ٹانکنا ہے۔ سوئی دھاگہ دے دو۔“ ناصر نے کہا۔

خرم کو یکدم بات سمجھ میں آگئی۔ ”ایک منٹ۔“

محمد فاروق انجم
قسط : 6

پھر طفیل نے تینوں کو گودام میں باندھ دیا۔

اندھیرا ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دیکھنے کی صلاحیت یکدم معدوم ہوگئی ہے۔ سکوت، رگوں میں خوف بھر رہا تھا۔ خرم نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی تو اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ اس کی پشت کی طرف کرکے کسی نے مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ خرم نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت مضبوط تھی۔ اس نے بولنا چاہا تو اسے محسوس ہوا جیسے بولنے کی طاقت کھو چکا تھا۔

اس نے اپنے جسم کو حرکت دینی بند کردی۔ وہ غور کرنے لگا۔ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ہلانے لگا اور پھر اپنا منہ کھولنا چاہا تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

خرم تاریک جگہ پر ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے اوپر ٹیپ لگادی گئی تھی۔ اسی طرح اس کے پیر بھی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو حرکت دینے اور بولنے کی طاقت سے محروم تھا۔

اسی طرح اس سے کچھ فاصلے پر ناصر اور ردا کو بھی باندھ دیا گیا تھا۔ لیکن کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور ان کے ساتھ کون ہے۔

خرم کو یاد آنے لگا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جب طفیل اپنے آدمیوں کے ساتھ ان تینوں کے سامنے موجود تھا تو اچانک طفیل نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا اور اس کی نال اس کے ماتھے پر ٹکادی تھی۔ وہ تینوں ساکت ہوگئے تھے۔

تب طفیل نے کہا تھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم تینوں کے پاس بڑا پیسہ ہے۔''

''ہے تو لے لو۔'' خرم نے اس اعتماد سے کہا کہ طفیل کو یقین آجائے کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔

''کہاں چھپایا ہے؟'' طفیل نے پوچھا۔

''تمہارے سامنے اور تمہاری جگہ پر کھڑے ہیں۔ ہم کہاں چھپا سکتے ہیں۔'' خرم کے لہجے میں ذرہ بھر لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ طفیل کو وہ اپنے اعتماد کی طاقت سے مات دے سکتا ہے۔

''تم تینوں کی تلاشی لینی پڑے گی۔'' طفیل نے باری باری تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کوئی مرد اس لڑکی کو ہاتھ لگائے، مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔'' خرم درشت لہجے میں بولا۔

''اگر ہاتھ لگایا تو کیا کرلوگے؟'' طفیل نے پوچھا۔

''اپنی زندگی کی پروا کئے بغیر اس کی حفاظت کروں گا۔'' خرم کے لہجے میں چٹان جیسی مضبوطی تھی۔ ردا نے سنا تو اس کے دل میں اطمینان کے ساتھ ایک عجیب سا احساس بھی ہوا۔ اور طفیل پر ان الفاظ نے جانے کیسا اثر کیا کہ وہ اپنے ارادے سے فوراً باز آگیا۔

''میں تم لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے شرافت اسی میں ہے کہ تم لوگ پیسہ نکال کر میرے سامنے رکھ دو۔''

''میں نے کہا کہ تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔ اس لڑکی کی تلاشی کے لئے کسی لڑکی کو لے آؤ۔ ہم اعتراض نہیں کریں گے۔'' خرم نے اپنی بات پھر دہرائی۔

طفیل کو لگ رہا تھا کہ خرم کا لہجہ اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ ان کے پاس کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ ورنہ وہ اس اعتماد سے نہ کہتا۔ پھر بھی اس نے اپنی تسلی کے لئے خرم اور ناصر کی تلاشی لی اور جو پیسے انہوں نے اپنی جیبوں میں ڈالے تھے، وہ نکال لئے۔ خرم نے بڑی رقم اپنی جیکٹ میں چھپائی ہوئی تھی۔ اس طرف اس کا دھیان گیا اور نہ اسے کسی قسم کا شک ہوا۔ ان سے فارغ ہوکر وہ ردا کی طرف متوجہ ہوا۔

''اب یہ لڑکی رہ گئی ہے۔ لڑکی کی تلاشی لڑکی ہی لے گی۔ لیکن میں اپنی تسلی کرکے رہوں گا۔''

اس نے اپنا ایک آدمی باہر بھیج دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ طفیل کے کہنے پر وہ عورت، ردا کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ چند لمحوں کے بعد عورت ردا کے ساتھ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں چند نوٹ تھے جو خرم نے اسے دیئے تھے۔ طفیل کے اشارے پر وہ عورت باہر چلی گئی۔

''تو یہ مال ہے۔'' طفیل نے یہ کہتے ہوئے جانے کیا اشارہ کیا کہ دو آدمیوں نے خرم اور ناصر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر تیسرے آدمی نے دونوں کو ایک ایک انجکشن دیا۔ خرم اور ناصر کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اپنی بند ہوتی آنکھوں سے خرم نے دیکھا کہ ایسا ہی انجکشن ردا کو بھی لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

جب ہوش آیا تو وہ ایک گھپ اندھیری جگہ پر تھا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ تینوں ایک ہی جگہ تھے اور تینوں کو نہیں پتا تھا کہ ان کے ساتھ کون ہے اور وہ کہاں ہیں۔ وہ ہوش میں آچکے تھے اور اپنے تئیں کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔

جس جگہ وہ تینوں بندھے تھے، اس کی چھت پر ایک روشن کمرا تھا۔ اس کمرے میں میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر طفیل بیٹھا تھا جبکہ اس کے برابر بیٹھا ہوا شخص نذر تھا۔

نذر جب اس شہر میں آیا تھا تو اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اداکار بنے۔ وہ آوازیں نکالنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے فنکار بننے کے لئے بڑے دھکے کھائے۔ لیکن کام کہیں نہ ملا اور وہ بھوکا پیاسا بھیک مانگنے پر مجبور ہوگیا۔ ایک بار چوری کر کے بھاگ رہا تھا تو اس کا سامنا طفیل سے ہوگیا اور طفیل اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ تب سے وہ طفیل کے ساتھ ہی کام کررہا تھا۔

طفیل نے نذر کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ساری بات سمجھنے کے بعد نذر نے اسلم بھائی کا فون ملایا۔ کچھ دیر کے بعد اسلم بھائی کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ ''ہیلو......کون؟''

''اسلم بھائی کام کا آدمی بول رہا ہوں۔ کچھ بات کرنی تھی۔'' نذر نے عجیب لہجہ اپنایا ہوا تھا کہ اس کی اصل آواز دب گئی تھی۔

''کیا بات کرنی ہے؟'' اسلم نے پوچھا۔

''میں مختصر اور پوائنٹ کی بات کرنے کا عادی ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی تلاش ہے۔''

''تم کون بول رہے ہو؟'' اسلم یکدم چونکا۔

''میں کون بول رہا ہوں۔ اس سے آپ کو کیا لینا دینا۔ کام کی بات کرو۔ وہ تینوں میرے پاس ہیں۔ لڑکوں میں سے ایک کا نام خرم اور دوسرے کا ناصر ہے جبکہ لڑکی کا نام ردا ہے۔ ان ہی کی تلاش ہے نا؟''

''یہ تمہارے پاس کیا کررہے ہیں؟''

''میرے گھر کی سفیدی کررہے ہیں۔'' نذر چھوٹتے ہی بولا۔ ''تم خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ کام کی بات کرو۔ انہیں لینا ہے تو سودا کرو۔''

''میں تمہیں پانچ منٹ بعد فون کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے پانچ منٹ کے بعد میں خود ہی فون کروں گا۔'' نذر نے کہہ کر فون بند کردیا۔

طفیل نے دوسرا فون اس کی طرف بڑھایا۔ ''اب تم اکبر کو فون کرو۔''

نذر نے دوسرا فون کھول کر اکبر کا نمبر ملایا تو جونہی دوسری طرف سے رابطہ ہوا، نذر نے ایک مختلف آواز میں کہا۔ ''اکبر سیٹھ، کام کا آدمی بول رہا ہوں۔''

''کون کام کا آدمی؟'' اکبر کو اس کی بات پر حیرت ہوئی۔

''دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی تلاش ہے نا آپ کو۔ وہ تینوں میرے پاس ہیں۔'' نذر نے کہا۔

''کون بول رہے ہو تم؟'' اکبر نے پوچھا۔

''یہ پوچھنے کا کیا فائدہ۔ کام کی بات پر آؤ۔ تینوں چاہئیں تو سودا کرو اور انہیں لے جاؤ۔'' نذر بولا۔

''تجھے کس نے بتایا کہ ہمیں ان کی تلاش ہے؟'' اکبر نے کریدا۔

''ان سوالوں کے چکر میں پڑے تو سودا دوسری پارٹی سے ہوجائے گا۔'' نذر بڑی ہوشیاری سے بات کررہا تھا۔

''کیا چاہتا ہے تو؟'' اکبر نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''ان کا کیا دوگے؟'' الٹا نذر نے پوچھ لیا۔

''جو پانچ، دس ہزار لینے ہیں، وہ لے لو اور بتاؤ کہاں آؤں؟'' اکبر بولا۔

''میں سمجھ گیا۔ تم کو لوگ نہیں چاہئیں۔ خدا حافظ۔'' نذر نے فون بند کردیا اور موبائل فون کی پاور بھی آف کردی۔

''اچھا کیا تم نے۔ ابھی پانچ منٹ بعد فون کھولنا۔'' طفیل نے کہتے ہوئے اپنی ٹانگ میز کے اوپر رکھی اور دوسری ٹانگ اس پر ٹکادی۔

☆.........☆.........☆

اسلم نے اسی وقت روشن خان کو فون کیا اور اسے ساری تفصیل سے آگاہ کردیا۔ روشن خان بات سننے کے بعد سوچنے لگا کہ یہ کون ہوسکتا ہے جس کے پاس وہ تینوں ہیں۔ اور اب وہ ان کے عوض مال بنانا چاہتا تھا۔

سوچ بچار کے بعد روشن خان اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تینوں سکندر کے ہاتھ لگ چکے ہیں اور اب وہ اس سے ان کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے سنا تھا کہ وہ لڑکوں کو مار کر صرف لڑکی کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اب کیا اس کا ارادہ بدل گیا ہے؟

روشن خان پھر مزید غور کرنے لگا۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے اسلم کو اپنا رازداں بنانے کا فیصلہ کیا۔ سکندر کی آنکھوں میں اگر کوئی آنکھیں ڈال سکتا تھا تو وہ اسلم تھا۔ کیونکہ اسلم نڈر بھی تھا اور سکندر کے ساتھ اس کی رقابت بھی تھی۔

روشن خان نے فون کرکے اسلم کو اپنے پاس بلالیا۔ راستے میں ہی اسلم کو پھر نذر کا فون آگیا۔ اسلم نے پوچھا۔ ''ان کے بدلے میں تمہیں کتنا پیسہ چاہئے؟''

''دس لاکھ روپے۔'' نذر نے طفیل کا اشارہ پاتے ہی بتایا۔

''اتنے قیمتی نہیں ہیں وہ۔'' اسلم بولا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور کے لئے تم سے زیادہ قیمتی ہوں۔'' نذر نے کہا۔

''وہ کون ہے؟''

''تم صرف اپنی بات کرو۔''

''اس کا مطلب ہے کوئی اور بھی ہے جو انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' اسلم نے کریدا۔

''تم فائنل بات کرو۔ باقی باتیں چھوڑ دو۔ جس کی بولی زیادہ ہوگی، میں وہ تینوں اس کے حوالے کردوں گا۔'' نذر نے کہا۔

''تم مجھے دس منٹ بعد فون کرنا۔'' اسلم کی گاڑی روشن خان کے آفس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے فون بند کردیا۔

اسلم سیدھا روشن خان کے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہی اس کال کے بارے میں بتایا۔ روشن خان سوچنے لگا۔ اسے سوچ میں مبتلا دیکھ کر اسلم نے پوچھا۔ ''ویسے اندر کی بات کیا ہے؟''

''اندر کی بات یہ ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنے والا تھا اور میرا ملازم خرم اسے لے بھاگا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا ملازم ناصر بھی ملا ہوا تھا۔ اب وہ تینوں ایک ساتھ ہیں۔ اور میری چالیس لاکھ روپے کی رقم بھی ان کے پاس ہے۔'' روشن خان نے بتایا۔

اس کی بات سن کر اسلم بولا۔ ''تو یہ بات ہے۔''

''مجھے شک ہے۔'' روشن خان نے اتنا کہہ کر اسلم کی طرف دیکھا۔ اسلم انتظار کرنے لگا کہ وہ اپنی بات آگے بڑھائے۔ ''مجھے شک ہے کہ وہ تینوں سکندر کے پاس ہیں۔''

''کون سکندر؟''

''وہی پولیس والا۔''

''آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' اسلم کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

''وہ بڑا کمینہ ہے۔ آستین کا سانپ ہے۔ دوستی کے روپ میں دشمنی نبھا رہا ہے۔ اس کی نظر بھی اس لڑکی پر تھی۔''

''میں شروع سے ہی کہتا رہا ہوں کہ یہ شخص دوستی کے قابل نہیں ہے۔ حرام خور ہے۔ پیسے کے لئے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ آپ کی ضرورت دیکھ کر وہ لالچی کتے کی طرح اب دُم ہلانے آجاتا ہے تاکہ اس کی جیب گرم ہوسکے۔'' اسلم کو غصہ آگیا۔

''اب کیا کریں؟''

''مجھے اجازت دیں۔ میں اس کی کھوپڑی میں سوراخ کردیتا ہوں۔'' اسلم بے چین ہوکر بولا۔

''اس کی کھوپڑی میں سوراخ کروگے تو پورے شہر کی پولیس تمہارے پیچھے لگ جائے گی۔'' روشن خان بولا۔

''جنہوں نے اونٹ رکھے ہوتے ہیں، ان کے دروازے بھی اونچے رکھنے پڑتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ میں اسے بہت پہلے مار چکا ہوتا۔ لیکن صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکا کیونکہ وہ آپ کا دوست تھا۔ اور آپ کے احسانات مجھ پر اتنے ہیں کہ میری گردن آپ کے سامنے اٹھ نہیں سکتی۔''

''غلطی ہوگئی کہ میں دوست کے اس روپ میں چھپے انسان کو پہچان نہیں سکا۔'' روشن خان بولا۔ ''اس نے مجھے بھی دھوکا دیا ہے۔ اس کی گردن کچلنی ہی پڑے گی۔''

اسی اثنا میں اسلم کا فون بجنے لگا۔ ایک نظر اسکرین کی طرف دیکھ کر اس نے روشن خان کی طرف دیکھا۔ ''اسی کا فون ہے۔''

''بات کرو۔''

''اب میں وہی کروں گا جو میری سمجھ میں ٹھیک ہوگا۔'' اسلم نے کہہ کر فون کان کو لگالیا۔ دوسری طرف نذر تھا۔

''کیا سوچا۔''

''کہاں آؤں؟''

''پہلے سودا تو کرلو۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''کتنا؟'' نذر نے تصدیق چاہی۔

''دس لاکھ روپے۔'' اسلم نے کہا۔

''اوکے۔ ایسا کرو ایک گھنٹے میں پیسے لے کر کباڑ مارکیٹ کے ڈاک خانے کے باہر پہنچ جاؤ۔ اپنا موبائل فون آن رکھنا۔'' نذر نے کہہ کر فون بند کردیا۔

اسلم نے فون بند کرکے کہا۔ ''مجھے دس لاکھ روپے بیگ میں ڈال دیں۔ ایک بیگ کہیں نہیں جائے گا۔ دیکھنا کیا ہے۔'' اسلم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

''لڑکی کے ساتھ خرم کو بھی بچالینا۔ اس کے پاس میرے چالیس لاکھ روپے ہیں۔'' روشن خان کہہ کر اٹھا اور دیوار میں نصب الماری کی طرف بڑھ گیا۔

☆.........☆.........☆

طفیل کی نگاہیں نذر پر مرکوز تھیں۔ نذر نے اسلم کو کباڑ مارکیٹ کے ڈاک خانے کے باہر آنے کا کہا تھا۔ اس بات پر طفیل کو غصہ آگیا تھا کہ اس نے اس سے پوچھے بغیر کباڑ مارکیٹ کے ڈاک خانہ کا کیوں کہہ دیا۔

نذر بھی فنکار آدمی تھا۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے دلیل دی۔ ''میں نے بہت اچھا کیا جو اسلم کو کباڑ مارکیٹ کے ڈاک خانہ کا بتایا ہے۔ اس طرح ان کا شک آپ پر نہیں جائے گا کیونکہ کوئی بھی کسی کو اس طرح اپنے ٹھکانے پر نہیں بلاتا۔''

''اسلم کا پہلا خیال میری طرف جائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اس علاقے کا چور کون ہے۔'' طفیل بولا۔

''اکبر کو فون لگاؤں؟'' نذر نے موضوع بدلنے کے لئے پوچھا۔

''تم نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا ہے۔'' طفیل ابھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔ وہ مضطرب ہوکر اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

''اگر پریشانی ہے تو میں دوبارہ فون کرکے جگہ بدل دیتا ہوں۔''

''اس طرح وہ شک میں پڑ جائے گا۔ میں اسلم کو جتنا جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔'' طفیل بولا۔

''تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ سب ٹھیک ہوگا۔'' ایک بار پھر نذر نے اسے تسلی دی۔ جبکہ طفیل کی پریشانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

☆.........☆.........☆

سکندر اور اکبر گاڑی میں موجود تھے۔ وہ کئی بار طفیل سے رابطے کی کوشش کرچکے تھے لیکن اس کا موبائل مسلسل بند مل رہا تھا۔ سکندر کے اعصاب پر ردا سوار تھی۔ یہ سارا انتظار اور کوشش وہ ردا کے لئے کررہا تھا۔ ان کے لئے یہ بات بھی حیرت کا باعث تھی کہ طفیل کی بجائے انہیں کسی اور نے فون کیا تھا۔ اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔

سکندر سوچتے ہوئے بولا۔ ''دو باتیں ہوسکتی ہیں۔''

''وہ کیا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''زیادہ پیسے کے چکر میں طفیل کسی اور سے فون کرا رہا ہے۔ یا پھر......'' سکندر بولتے ہوئے رک گیا۔ اکبر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ سکندر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''یا پھر طفیل نے پیسے لے کر ان تینوں کو کسی اور کے حوالے کردیا ہے۔ اور اسے یہ بھی پتا ہے کہ ان تینوں کی کسے تلاش ہے۔''

سکندر کی بات سن کر اکبر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ کا نشانہ ٹھیک جگہ لگا ہے۔''

''تو پھر ایسا کرو کہ ابھی کباڑ مارکیٹ چلو۔'' سکندر بولا۔

''وہاں کیا ہے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''طفیل وہاں ہی رہتا ہے اور اسی جگہ اس کا کاروبار ہے۔'' سکندر بولا۔

''اگر اس نے ان تینوں کو پیسے لے کر کسی اور کو دے دیا ہے تو اس کے پاس جاکر کیا کریں گے؟''

''طفیل لالچی ہے۔ پیسے کا لالچ دے کر پوچھ لیں گے کہ اس نے ان تینوں کو کس کے حوالے کیا ہے۔ اگر بتادیا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اسے اوپر پہنچا دیں گے۔''

''ہاں۔ اگر وہ اس کے پاس ہوئے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔'' اکبر نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس رفتار سے کار گھمائی کہ وہاں دھول کے بادل چھا گئے۔

☆.........☆.........☆

طفیل نے پانی سے بھرا گلاس اپنے حلق سے نیچے اتارا اور گردن گھما کر نذر کی طرف دیکھا جو کرسی پر بڑے مزے سے براجمان تھا۔

''اسلم کا فون نہیں آیا۔'' طفیل نے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں آیا۔'' نذر نے جواب دیا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں اسلم ہم تک نہ پہنچ جائے۔'' طفیل نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

''آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے یہاں بیٹھنا۔ اسلم کے پاس پیسہ لینے میں جاؤں گا۔'' نذر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اور جب وہ ان تینوں کا مطالبہ کرے گا تو کیا جواب دوگے۔'' طفیل نے پوچھا۔

''کہو تو وہ جگہ بتادوں جہاں ان کو رکھا ہے۔'' نذر نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ انہیں بتادینا۔ اس وقت وہ تینوں جس جگہ ہیں، وہ جگہ میری نہیں ہے، متنازع جگہ ہے۔ کئی سالوں سے اس پر کیس چل رہا ہے۔ اور میں نے اپنے گودام سے خفیہ راستہ بنایا ہوا ہے۔'' طفیل بولا۔

''بس وہ راستہ بند کردینا۔''

''وہ راستہ ایسی جگہ ہے جہاں کسی کا باپ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ تم سارا کام ہوشیاری سے کرنا۔ پیسہ لے کر میرے پرانے والے گھر پہنچ جانا۔'' طفیل بولا۔

اسی وقت نذر کے ہاتھ میں موجود موبائل فون بجنے لگا۔ دونوں نے بیک وقت موبائل فون کی طرف دیکھا۔

''کس کا فون ہے؟'' طفیل نے جلدی سے پوچھا۔

''اسلم بھائی ہے۔'' نذر نے بتایا۔

''بات کرو لیکن ہوشیاری سے۔'' طفیل نے کہا۔

نذر فون کان سے لگا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''ہیلو۔''

''میں اس وقت کباڑ مارکیٹ کے ڈاک خانہ کے باہر کھڑا ہوں۔'' دوسری طرف سے اسلم کی آواز آئی۔

''پیسہ لے کر آئے ہو؟'' نذر نے سوال کیا۔

''تو کیا خالی ہاتھ آتا؟'' اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

''میرا انتظار کرو۔ میں دومنٹ کے بعد فون کرتا ہوں۔'' نذر نے یہ کہہ کر فون بند کردیا اور سوالیہ نگاہوں سے طفیل کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم جاؤ۔ ہوشیاری سے فون کرتے ہوئے اسے اس گودام کے دروازے تک لے آؤ۔ پیسے اس گودام کے پیچھے جو کوڑے کا ڈرم پڑا ہے، اس میں رکھنے کی ہدایت کرو۔ ان تینوں کا پوچھے تو کہہ دینا، پیسے رکھو پھر بتاتا ہوں۔ پیسے رکھتے ہی اسے اس گودام کا بتادو۔''

''وہ اس گودام میں جانے کا راستہ پوچھے تو؟''

''اس گودام کے تالے جانے کب سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ صرف شٹر ہی بند ہوتا ہے۔ اسے کہنا کہ کھولو اور اپنے بندے لے جاؤ۔''

نذر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ وہ محتاط انداز میں گلیاں عبور کرتا ہوا ڈاک خانے سے کچھ دور پہنچ گیا۔

نذر نے دیکھا کہ اسلم ڈاک خانے کے بند گیٹ کے پاس کھڑا متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ تھا۔ نذر نے اس کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کوئی دوسرا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اپنی تسلی کرنے کے بعد نذر نے اسے فون کیا اور بولا۔ ''بیگ لیٹر بکس کے نیچے رکھ دو۔''

''میرے آدمی کہاں ہیں؟'' اسلم نے پوچھا۔

''بیگ رکھ کر آگے آجاؤ، میں بتاتا ہوں کہ وہ تینوں کہاں ہیں۔'' نذر نے کہا۔

''میں ایسے بیگ نہیں رکھوں گا۔ پہلے مجھے دکھاؤ کہ وہ تینوں کہاں ہیں۔ اور پھر جونہی میں بیگ رکھوں، تم تینوں کو میری طرف بھیج دوگے۔'' اسلم بیدار دماغ کے ساتھ اس سے بات کررہا تھا۔

اس کی بات سن کر نذر نے ہونٹ بھینچ لئے اور پھر کہا۔ ''پہلے تم بیگ رکھو، پھر آگے گلی میں آؤ وہاں ایک گودام ہے، اس جگہ وہ تینوں محفوظ ہیں۔''

''جب تک میں انہیں دیکھوں گا نہیں، بیگ نہیں رکھوں گا۔'' اسلم اپنی ضد پر اڑ گیا۔ دراصل اسلم چاہتا تھا کہ وہ غصے میں کوئی ایسی غلطی کرے جس سے یہ پتا چل جائے کہ فون پر کون ہے۔ وہ شاید اس غصے میں سامنے آجائے تو اس کا کام آسان ہوجائے گا۔ وہ جان بوجھ کر بات کو الجھا رہا تھا۔

''دیکھو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر تم ضد کروگے تو ہم غصہ کریں گے اور غصے میں اگر گولی چل گئی تو پھر ہمیں الزام مت دینا۔'' نذر اپنی کوئی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس بات نے اسلم کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ پھر وہ بولا۔ ''بیگ کہاں رکھنا ہے؟''

''ہاں اب ٹھیک بات کی ہے۔ بیگ لیٹر بکس کے نیچے رکھ دو۔'' نذر مسکرایا۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو شاباش دی کہ وہ بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے کام کررہا ہے۔

اسلم نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا اور پھر وہ بیگ رکھنے کے لئے لیٹر بکس کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ لیٹر بکس سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ٹھیک اسی وقت ایک کار گلی میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔ اس میں سکندر اور اکبر تھے۔

اسلم کی کار کی طرف پشت تھی۔ اس لئے وہ دیکھ نہیں سکا کہ اس کے پیچھے کب کار آکر رکی۔ کار میں سوار سکندر اور اکبر بھی یہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ لیٹر بکس کے پاس کون کھڑا ہے۔

کار کے دروازے ایک ساتھ کھلے اور دونوں نے ایک ساتھ باہر قدم رکھا۔ سکندر نے لیٹر بکس کے پاس کھڑے اسلم کو عقب سے مخاطب کیا۔ ''کیا تم یہاں رہتے ہو؟''

اسلم ٹھٹکا۔ وہ سکندر کی آواز کو بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ حیرت سے کھڑا سوچنے لگا کہ سکندر کب اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا اور وہ یہاں کیا کررہا ہے؟

نذر جو ایک طرف چھپا ہوا تھا، اس نے بھی سکندر اور اکبر کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی نذر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''یہ کیا کرنے آگئے یہاں۔'' نذر بڑبڑایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ طفیل کو ان کے آنے کی اطلاع کردے۔ اس نے موبائل فون اپنے کان سے لگایا اور مضطربانہ انداز میں طفیل کے فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں ان تینوں پر مرکوز تھیں۔ اسلم لیٹر بکس کے پاس پشت کئے کھڑا تھا جبکہ سکندر اور اکبر اس کے عقب میں کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں طفیل کی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''سکندر اور اکبر بھی پہنچ گئے ہیں۔'' نذر نے بتایا۔

''کیا......؟'' طفیل کی ششدر آواز آئی۔

''وہ دونوں اس وقت اسلم بھائی کے پیچھے کھڑے ہیں۔ اسلم بیگ لیٹر بکس کے نیچے رکھنے والا ہی تھا۔'' نذر نے مزید بتایا۔

''ہوشیار ہوجاؤ۔ اور مجھے بتاتے رہنا کہ کیا ہورہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' طفیل کے لہجے کی بے چینی بتارہی تھی کہ وہ سخت الجھن کا شکار ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ نذر اسی جگہ کھڑا ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''بھائی صاحب آپ سے کچھ پوچھا ہے ہم نے۔'' اس بار اکبر بولا تو اسلم کی حیرت سے بھنویں چڑھ گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ سکندر اکیلا نہیں ہے، اس کے ساتھ اکبر بھی ہے۔ وہ اکبر کی آواز بھی اچھی طرح پہچانتا تھا۔

اسلم کو اندیشہ بھی ہوا کہ ممکن ہے کہ وہ دو کی بجائے زیادہ ہوں۔ اگر وہ اسی وقت گھوما تو وہ اسے دیکھتے ہی سیخ پا ہوجائیں گے۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ اپنے سے زیادہ لوگوں کے ساتھ اکیلا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ دائیں طرف والی گلی کی طرف چل پڑے۔

اسلم نے ایسا ہی کیا اور ان کے سوال کا جواب دیئے بغیر تیزی سے دائیں طرف بڑھا۔ نذر اسی طرف ایک دیوار کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اسلم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ ہوشیار ہوگیا۔ سکندر اور اکبر نے جب یہ دیکھا کہ اس آدمی نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک طرف چلنا شروع کردیا ہے تو دونوں نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اکبر چلایا۔ ''اے......رکو؟''

اسلم نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ سکندر اور اکبر اس کے پیچھے بھاگے۔ اسلم کو اندازہ تھا کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئیں گے۔ وہ بھی بھاگا۔ نذر کے لئے اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس جگہ سے نکل جائے۔ جس دیوار کے پیچھے وہ بیٹھا تھا، وہ دیوار چھوٹی تھی۔ جونہی وہ اٹھا، اس کا چہرہ عیاں ہوگیا۔ اسلم نے اسے دیکھا تو سمجھا کہ یہ سکندر کا آدمی ہے۔

اسلم نے بھاگتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور اس کا گریبان پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ پیچھے سکندر اور اکبر بھاگتے آرہے تھے۔ نذر کو جس قوت سے اسلم نے پیچھے پھینکا تھا، اسی قوت سے وہ اکبر سے جا ٹکرایا۔

نذر کا سر اکبر کی ناک پر اس زور سے لگا کہ وہ اپنی ناک پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جبکہ نذر کو یوں لگا تھا جیسے وہ کسی پہاڑ سے ٹکرا گیا ہو۔ اکبر سے ٹکراتے ہی وہ زمین پر گر گیا تھا۔ سکندر کے بھاگتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر نذر کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔ ''کون ہو تم؟''

حواس باختہ نذر بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تم ہو کون؟'' سکندر نے اسے جھنجوڑا۔

''میں نذر ہوں۔''

''نذر کون؟'' سکندر نے اگلا سوال کیا۔ اسی اثنا میں نذر کے ہاتھ میں موجود فون بجنے لگا۔ سکندر نے اس کے ہاتھ سے فون لیا اور کان سے لگالیا۔ دوسری طرف سے طفیل کی آواز آئی۔

''ہاں بول نذر کیا ہوا ہے۔ سکندر اور اکبر اسی جگہ ہیں یا چلے گئے ہیں۔ اور اسلم نے پیسوں کا بیگ دیا کہ نہیں۔''

سکندر غور کرنے لگا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ جب طفیل کو اپنے سوالات کا جواب نہیں ملا تو اس کی آواز پھر آئی۔

''ہیلو نذر تم بول کیوں نہیں رہے ہو؟ کیا ہوا ہے۔ ہیلو ہیلو۔'' پھر دوسری طرف سے آواز آنی بند ہوگئی۔

''کون تھا یہ؟'' سکندر نے نذر سے پوچھا۔

''ط......طفیل تھا۔'' کمزور دل نذر نے جواب دینے میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔

''طفیل۔'' سکندر نے اس کا نام لیتے ہوئے اکبر کی طرف دیکھا۔ ''اس وقت طفیل کہاں ہے؟''

''اُدھر۔'' نذر نے سامنے گلی کی طرف اشارہ کیا۔

''طفیل نے اسلم کا بھی تو نام لیا تھا۔ کہیں یہ اسلم بھائی تو نہیں تھا؟'' اکبر نے سوال کیا۔

''وہی تھا۔'' نذر نے پھر سچ کہا۔

''وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''وہ ان تینوں کو لینے آیا تھا۔'' نذر نے کہا۔

''وہ تینوں طفیل کے پاس ہیں۔'' سکندر بولا۔

''ہاں جی۔'' نذر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کہاں ہیں وہ؟'' سکندر نے پھر درشت لہجہ اپنالیا۔

''اُدھر۔'' نذر نے ایک بار پھر اسی طرف اشارہ کیا۔

''چلو ہمارے ساتھ۔'' سکندر نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا گلی کی طرف لے جانے لگا۔

☆.........☆.........☆

طفیل کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہوگیا۔ اور اسے اب کیا کرنا چاہئے۔ نذر کو جب اس نے فون کیا تو وہ بولا کیوں نہیں۔ کہیں وہ ان کے ہاتھ تو نہیں آگیا؟

اس خیال نے طفیل کو مزید بے چین کردیا۔ وہ فوراً گودام کی چھت سے نیچے اترا اور ایک طرف جانے لگا۔ پھر اچانک رک گیا۔

اس نے سوچا کہ سکندر اس جگہ پہنچ گیا ہے۔ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اپنی جان بچانے کے لئے اس جگہ کو چھوڑنا بہت ضروری تھا۔ اور اب اگر اس نے ان تینوں سے خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا تو پھر سکندر بھی کیوں حاصل کرے۔ بہتر ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔ ان کی قسمت میں ہوا تو وہ بھاگ جائیں گے ورنہ سکندر انہیں پکڑ لے گا۔

یہ سوچتے ہی طفیل نے اپنے موبائل فون کی لائٹ روشن کی اور وہ کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے گودام میں بنے ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہوتا ہوا دیوار میں بنے راستے سے دوسری طرف چلا گیا۔ کوئی عام آدمی اس جگہ تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

دوسری طرف بھی بہت سا کباڑ پڑا تھا۔ طفیل کو راستہ معلوم تھا۔ وہ ان تینوں تک پہنچ گیا۔ وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے تھے اور پاؤں بھی کھلے نہیں تھے۔

طفیل نے ایک کے ہاتھ کھولے اور تیزی سے اس راستے کی طرف چل پڑا جس طرف سے وہ آیا تھا۔ اسی راستے سے ہوتا ہوا وہ دوسری طرف چلا گیا۔

طفیل جلدی میں ناصر کے ہاتھ کھول گیا تھا۔ ناصر نے ہاتھ کھلتے ہی جلدی سے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکال کر اس نے اپنے پیر کھولے اور بولا۔ ''کوئی ہے؟''

اسے پاس سے ہی 'ہوں ہوں' کی آوازیں آنے لگیں۔ ناصر کی آواز سن کر ردا اور خرم بولنے کی کوشش کرنے لگے تھے لیکن منہ میں ٹھنسے کپڑے کی وجہ سے وہ بول نہیں پارہے تھے۔

مکمل اندھیرا تھا۔ اپنے آپ کو آزاد کرانے کے بعد ناصر اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر بولا۔ ''فکر مت کرو میں آزاد ہوگیا ہوں۔''

ناصر اندازے سے آگے بڑھا۔ پھر دائیں مڑا، چند قدم چلا تو اس کا ہاتھ کسی کے سر سے ٹکرایا۔ ''تم شاید خرم ہو۔ ایک منٹ۔'' ناصر نے ٹٹولتے ہوئے اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ پھر اسی طرح اس نے اس کے پیر بھی کھول دیئے۔ آنکھوں سے پٹی اور منہ سے کپڑا خود خرم نے ہٹا دیا تھا۔

''ہم کہاں ہیں؟'' خرم نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''ردا کہاں ہے؟'' خرم نے پوچھا۔

''وہ یہیں ہوگی، اسے تلاش کرو۔'' ناصر سے کہہ کر خود بھی اپنے ہاتھ پھیلا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ اچانک خرم کا ہاتھ ردا سے ٹکرایا تو وہ چلایا۔ ''مل گئی۔''

''کہاں ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اب تم مجھے تلاش کرو۔ میں اسے کھولتا ہوں۔'' خرم نے اس کے ہاتھوں کی رسی کھولتے ہوئے کہا۔ ہاتھ کھلتے ہی ردا نے آنکھوں سے پٹی ہٹا کر منہ سے کپڑا نکالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تب تک خرم اس کے پیروں کی رسی بھی کھول چکا تھا۔

''شکر ہے ہم آزاد ہوگئے۔'' ردا بے اختیار بولی۔

ناصر آواز کی سمت بڑھا اور اس نے خرم کو پکڑ لیا۔

''ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' ناصر نے کہا۔

''کیسے نکلیں گے؟'' خرم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس گھپ اندھیرے میں وہ کیسے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کریں گے۔

''ناصر تم آگے آجاؤ۔ تمہارے پیچھے میں ہوں گا اور آخر میں ردا ہوگی۔ دیکھو ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑنا۔'' خرم نے کہا۔

پھر ان تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھے۔ ناصر نے اپنا ایک ہاتھ آگے پھیلایا ہوا تھا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر بڑھنے لگے۔

☆......☆......☆

نذر کی حالت ایسی ہورہی تھی جیسے ابھی اس کا دل دھڑکنا بند ہوجائے گا۔ وہ بری طرح سے گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ سکندر کو خوب جانتا تھا۔ نذر کو اپنی بھلائی اسی میں نظر آرہی تھی کہ وہ سکندر کو صحیح سمت لے جائے تاکہ اسے اپنی غلطی اور جھوٹ کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ اس لئے وہ سکندر اور اکبر کو اس گودام تک لے آیا جو طفیل کی ملکیت تھا اور اس گودام سے اس گودام کی طرف راستہ جاتا تھا جہاں وہ تینوں قید تھے۔

سکندر اور اکبر اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے تعاقب میں اسلم تھا۔ اسلم اس وقت اس جگہ سے بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن آگے جاکر وہ ایک جگہ چھپ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں نے نذر کو پکڑ لیا اور جب وہ دونوں نذر کو لے کر گودام کی طرف چلے تو اسلم بھی دبے پاؤں ان کے پیچھے ہولیا۔

''یہ کہاں لے آئے تم؟'' سکندر نے دائیں بائیں جائزہ لیا۔

''یہ طفیل کا گودام ہے۔'' نذر نے بتایا۔

''وہ خود کہاں ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

''یہیں کہیں ہوگا۔''

''اور وہ تینوں کہاں ہیں؟'' سکندر بولا۔

''اس طرف سے راستہ جاتا ہے۔ وہ تینوں ساتھ والے گودام میں قید ہیں۔'' نذر نے بتایا۔

''چلو وہاں۔'' سکندر نے اسے آگے کی طرف دھکا دیا اور اس کے ساتھ ہی سکندر اور اکبر نے اپنے اپنے ریوالور نکال لئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر نذر کی گھبراہٹ دوچند ہوگئی تھی۔

''وہاں اندھیرا ہے، روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس الماری میں ٹارچ رکھی ہوئی ہے۔'' نذر نے کہا۔

''نکالو ٹارچ۔'' سکندر کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ نذر نے ڈرتے ڈرتے الماری کی طرف قدم بڑھائے اور ایک پٹ کھول کر ایک بڑی ٹارچ نکال لی۔ پھر وہ ان کے آگے چلنے لگا جبکہ وہ دونوں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ اور وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اسلم بھی ان کے پیچھے بے آواز چلا آرہا ہے۔

جس راستے سے طفیل گودام میں پہنچا تھا، اسی راستے سے نذر بھی ان کو وہاں لے آیا تھا۔ نذر نے جونہی قدم اندر رکھا، ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی تیز روشنی دور تک گئی تو گودام میں موجود وہ تینوں جو اندھیرے کے ساتھ لڑ رہے تھے، اچانک روشنی دیکھ کر رک گئے۔

''کوئی آیا ہے۔'' ناصر نے سرگوشی کی۔

''ان کے پاس لائٹ بھی ہے۔'' خرم کا لہجہ بھی دھیما تھا۔

''ہوشیار رہنا۔ بس اسی جگہ رک جاؤ۔'' ناصر نے کہا اور تینوں پرانے کباڑ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔

گودام میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر اور اکبر اسی جگہ رک گئے۔ سکندر نے اشارہ کیا تو اکبر نے نذر کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی۔

''کہاں ہیں وہ؟'' سکندر نے پوچھا۔

''اس طرف باندھے ہوئے ہیں۔'' نذر نے جواب دیا۔

''اس جگہ تک لے کر چلو۔'' سکندر بولا۔

نذر چلنے لگا اور اس کے ساتھ سکندر اور اکبر بھی بڑھنے لگے جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر اسلم بھی تعاقب میں تھا۔ اسلم چاہتا تو اسی وقت سکندر اور اکبر کو مار کر اپنا حساب برابر کردیتا لیکن وہ ابھی ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ان تینوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ کباڑ کے ساتھ لگے تینوں کی طرف روشنی بڑھ رہی تھی۔ ناصر جلدی سے ایک طرف ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی خرم اور ردا بھی سمٹ گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ روشنی قریب آرہی تھی۔ وہ کسی طرف بھاگ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس اندھیرے میں بھاگنا ممکن نہیں تھا۔

روشنی مزید قریب آرہی تھی۔ تینوں کباڑ کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ اتنی روشنی وہاں ہوگئی تھی کہ پہلی بار ان تینوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا تھا۔ ناصر نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے ساکت کھڑے رہنے کی تاکید کی۔

''کہاں لے آئے ہو تم۔'' سکندر کی غصیلی آواز نے تینوں کو چونکا دیا۔

''یہ ساتھ ہی باندھے ہوئے ہیں۔'' نذر کی گھبرائی آواز سنائی دی۔

تینوں چلتے ہوئے ٹھیک اس جگہ پہنچ گئے جہاں کباڑ کے ایک طرف وہ تینوں لگ کر کھڑے تھے۔ اگر سکندر ذرا سا دائیں جانب چلتا تو وہ تینوں اس کے سامنے ہوتے۔

''یہاں تو اندھیرے کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' سکندر اس جگہ رکتے ہی بولا۔

نذر کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی خیرہ نگاہیں ٹارچ کی روشنی کے ساتھ اس جگہ منجمد تھیں جہاں ان تینوں کو باندھا گیا تھا۔ کرسیاں خالی تھیں اور فرش پر رسیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

''وہ تینوں کہاں گئے؟'' سکندر نے نذر کو سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ بے چارہ نذر اس کے ہاتھ میں کسی کھلونے کی طرح جھول رہا تھا۔

''وہ سامنے کرسیوں پر باندھے ہوئے تھے۔'' نذر نے تقریباً روتے ہوئے انداز میں خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

سکندر نے اس کی بات سنتے ہی اسے چھوڑا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں خالی کرسیوں اور فرش پر پڑی رسیوں کو دیکھنے لگا۔

''وہ یہاں باندھے گئے تھے تو پھر کہاں گئے؟'' سکندر پھر نذر کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے پتا نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' نذر نے کہا۔

''تو سچ کہہ رہا ہے؟'' سکندر نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ تینوں اسی جگہ تھے۔''

''طفیل کہاں ہے؟''

''اس کا مجھے معلوم نہیں۔ کہیں بھاگ نہ گیا ہو۔ اور ہوسکتا ہے وہ ان تینوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا ہو۔''

''جب تجھے کچھ پتا نہیں ہے اور سب کچھ ہمیں ہی کرنا ہے تو تُو پھر کس کام کا۔'' سکندر نے کہا اور ریوالور اس پر تانتے ہوئے گولی چلادی۔

گودام میں گولی کی آواز بم کی طرح سنائی دی اور مارے خوف کے ردا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لڑکی کی چیخ سن کر سکندر اور اکبر نے چونک کر اندھیرے میں بغور دیکھنا شروع کردیا۔ پھر اکبر نے ٹارچ سیدھی کی اور دائیں بائیں اس کی روشنی ڈالنے لگا۔

(جاری ہے)

محمد فاروق انجم

قسط : 7

وہ تینوں مزید کباڑ کے سامان کے ساتھ چپک گئے تھے۔ خرم نے ردا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ردا کے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ نکلی تھی۔ وہ فوراً سنبھل گئی تھی۔ اسلم ان سے کچھ فاصلے پر تھا اس لئے وہ ردا کے منہ سے نکلنے والی چیخ نہیں سن سکا تھا۔ البتہ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ہاتھ میں موجود ٹارچ کی روشنی پورے گودام میں رقص کر رہی ہے۔

”کوئی لڑکی ہے اس جگہ۔“ سکندر ٹارچ کی روشنی کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”جو کوئی بھی اس جگہ ہے وہ باہر نکل آئے ورنہ نتیجہ برا ہوگا۔“ اکبر دھاڑا۔

اسلم سمجھا شاید یہ اعلان اس کے لئے ہے۔ وہ مزید ہوشیار ہو کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی اور کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔

وہ تینوں ابھی بھی اپنی جگہ مستعد کھڑے تھے جبکہ اس گہرے اندھیرے میں کسی طرف بھی بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ دراصل یہ گودام کئی سالوں سے بند تھا۔ اس جگہ دو شراکت دار کام کرتے تھے۔ گودام ایک شراکت دار کے نام پر تھا جبکہ دوسرے کی بھی سرمایہ کاری تھی۔ جب دونوں کے درمیان چپقلش ہوئی اور کاروبار بند کر کے تقسیم کا عمل شروع ہوا تو بات بگڑ گئی اور بات عدالت تک جا پہنچی۔ [illegible]

جب دونوں شراکت دار عدالت کی طرف بڑھے تھے تو ایک نے اس گودام کے روشن دان تک بند کر دیئے تھے۔ شٹر کو ایک نے تالا لگایا تو دوسرے نے تالے کے اوپر تالا لگا دیا۔ طفیل کا گودام اس سے ملحق تھا اس لئے اس نے ان دونوں کے جھگڑے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے گودام سے راستہ بنا لیا اور یہاں موجود سامان کو بیچنے لگا۔

عدم ادائیگی کی وجہ سے بجلی کٹ چکی تھی۔ اندر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

سکندر ایک طرف کھڑا تھا اور اکبر کے ایک ہاتھ میں ٹارچ جبکہ دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ بے خیالی میں قدم اٹھاتے ہوئے بالکل خرم کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔ خرم نے اپنی سانس روک لی تھی۔ اکبر ٹارچ کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ خرم ٹارچ کی روشنی میں سکندر سے کچھ فاصلے پر دوسری طرف منہ کئے کھڑا نظر آیا۔

خرم کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ اس نے ردا کا ہاتھ چھوڑا اور برق رفتاری سے ایک ہاتھ اکبر کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے اس قوت سے دھکا دیا کہ ٹارچ خرم کے ہاتھ میں آ گئی اور اکبر دور جا گرا۔

خرم نے ٹارچ فوراً بند کر دی۔ اور ردا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اکبر نے گرتے ہی فائر کیا۔

”کیا ہوا؟“ سکندر چلایا۔

”کسی نے میرے ہاتھ سے لائٹ چھین لی ہے اور مجھے دھکا دیا ہے۔“ اکبر بولا۔

”فائرنگ کرو۔“ سکندر نے کہا۔ ”مگر کہاں کہیں ہم ایک دوسرے کی گولی کی زد میں نہ آ جائیں۔“

اکبر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خرم ایک طرف بڑھنے لگا۔ تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد خرم نے ایک لمحے کے لئے لائٹ روشن کی اور ایک نظر روشنی کی مدد سے راستہ دیکھ کر بند کر دی۔ اور تیزی سے اس طرف بڑھنے لگا۔

”اس طرف روشنی ہوئی ہے۔“ سکندر بولا اور جونہی وہ آگے بڑھا اکبر سے ٹکرایا۔

خرم اسی طرح روشنی کرتا اور راستہ دیکھتا اور آگے چل پڑتا۔ اسی طرح دائیں بائیں چلتے ہوئے اس نے روشنی کی مدد سے دیوار میں راستہ دیکھ لیا۔ وہ اس طرف دوڑ پڑے۔

اسلم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سکندر اور اکبر موجود تھے۔ جب اکبر کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ دائیں بائیں روشنی کر رہا تھا تو سکندر نے سامنے دیکھی تھی اور جن کریٹوں پر ان تینوں کو دیکھا تھا وہاں پاس ہی فرش پر ایک موٹا سریا موجود تھا۔

سکندر اندازے سے اس طرف بڑھنے لگا اور فرش پر اس سریے کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سریا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

”سکندر تم کہاں ہو؟“ اکبر کی آواز آئی۔

”تم جہاں ہو اسی جگہ رک جاؤ۔“ سکندر بولا۔

سکندر ادھر بڑھنے لگا جس طرف اسے اندازہ تھا کہ وہاں دیوار ہے۔ چلتے چلتے وہ دیوار سے ٹکرایا۔ ایک ہاتھ سے دیوار کی تسلی کرنے کے بعد اس نے سریے کا وار کیا تو دیوار کی بغیر پلستر کی اینٹ نکل کر باہر جا گری اور روشنی کی لکیر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی سکندر سریا مار کر اینٹیں نکالنے لگا۔

سکندر اینٹیں نکال رہا تھا۔ اس کے عقب میں اکبر کھڑا تھا اور اس کے پیچھے اسلم تھا۔ گودام میں روشنی پھیل گئی تھی۔ اسلم دونوں کو اپنے سامنے صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور سامنے کھڑے اکبر کی گردن کا نشانہ لیا۔

اس سے پہلے کہ اسلم فائر کرتا، سکندر نے گھوم کر اکبر کی طرف دیکھا تو اس کے عقب میں کھڑے اسلم پر نظر پڑ گئی۔ سکندر چلایا۔ ”اکبر جھک جاؤ۔“

اکبر فوراً جھک گیا۔ اسلم کے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی دیوار پر جا لگی اور اسی اثنا میں سکندر نے اس پر فائر کھول دیا۔ اسلم کی خوش قسمتی تھی کہ گولی خطا ہو گئی اور اسلم کو اندھیرے میں گم ہونے کا موقع مل گیا۔

سکندر نے اکبر کو اشارہ کیا۔ دونوں دیوار میں بنے راستے سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

وہ تینوں طفیل کے گودام میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں روشنی تھی۔ خرم نے ٹارچ ایک طرف پھینکی اور اس دروازے کی طرف بڑھے جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔

ناصر نے روک لیا۔ ”شاید باہر کوئی ہو۔“

”پھر کیا کریں۔“ خرم نے پوچھا۔

”کوئی دوسرا راستہ دیکھیں۔“ ناصر نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا تو انہیں اوپر جاتی سیڑھیاں دکھائی دیں۔ وہ بولا۔ ”اوپر چلیں۔“

”اوپر جا کر کیا کریں گے۔“ ردا نے کہا۔

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ ناصر کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے خرم اور ردا بھی چل دیئے۔

اوپر چھت تھی جہاں طفیل نے بیٹھ کر فون کئے تھے۔ اوپر پہنچ کر وہ ایک طرف چل پڑے۔ آگے چھت ختم ہو جاتی تھی۔ تینوں نے نیچے دیکھا تو نیچے پلاسٹک کی خالی بوتلوں کا انبار تھا اور سامنے کئی گلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

”یہ راستہ ٹھیک ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”نیچے جائیں گے کیسے؟“ ردا نے پوچھا۔

”کودنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔“ خرم بولا۔

”کودنا پڑے گا؟“ ردا حیرت زدہ ہوئی۔

”پلاسٹک کی بوتلیں ہیں، کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے۔“ خرم نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ناصر نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ خرم نے بھی وقت ضائع نہیں کیا اور ردا کو ساتھ لے کر نیچے کود گیا۔

خالی بوتلوں پر گرنے کے بعد دھماکے ہوئے اور دائیں بائیں کام کرتے لوگ اٹھ کر اس طرف دیکھنے لگے۔

تینوں پھرتی سے اٹھے اور پلاسٹک کی خالی بوتلوں کو اپنے ہاتھوں سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر نکلے اور ایک طرف دیکھتے ہوئے لوگوں کی پروا کئے بغیر وہ اس گلی کی طرف نکل گئے جہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

جس وقت کباڑ مارکیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ کباڑ مارکیٹ سے کچھ دور ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر کروڑ پتی باپ کی بیٹی کو اغوا کرنے کی پوری منصوبہ بندی ہو چکی تھی۔

اس کروڑ پتی شخص کا نام شمس الدین تھا۔ اس نے چھوٹے پیمانے سے کاروبار شروع کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کاروبار نے وسعت اختیار کر لی تھی۔ شمس الدین بہت مطلبی اور خود غرض انسان تھا۔ اس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے دشمنوں کو قابو کرنے کے لئے اس نے زبردست حل نکالا تھا۔ اس حل کی وجہ سے اس کے دشمن پیچھے ہٹ گئے تھے۔

[illegible]

”شمس الدین بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کچھ دیر کے بعد آواز آئی۔

”انکل میں کرن بول رہی ہوں۔“ گھبرائے ہوئے انداز میں کرن نے کہا۔

”بولو بیٹا کیا بات ہے۔“ شمس الدین کے لہجے میں اطمینان تھا۔

”انکل کوئی آدمی یمنیٰ کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔“ کرن نے بتایا۔

”کیا؟“ شمس الدین کے لہجے کا اطمینان یکدم کافور ہو گیا۔

[illegible]

”یہ سب کیسے ہوا؟“ شمس الدین نے آتے ہی پوچھا۔

”انکل یہ سب اچانک ہوا۔“ کرن نے گھبرائے لہجے میں روداد بیان کی۔

”تم نے اس کا کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟“ شمس الدین نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کرن نے نفی میں سر ہلایا۔

[illegible]

(جاری ہے)

محمد فاروق انجم

قسط: 8

عینی کو پانی پینے کے بعد اپنے جسم میں مزید توانائی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر ان تینوں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا تم لوگوں نے واقعی مجھے اغوا نہیں کیا؟“

”آپ یقین کریں، ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہم ایک جال سے نکل کر بھاگے تھے۔ فرار کے لئے ہمیں یہ کار خالی ملی تو ہم اس میں سوار ہو کے یہاں تک آ گئے۔“ خرم نے عینی کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

عینی کو ان کی باتوں پر یقین آ گیا۔ وہ بولی۔ ”مجھے گاڑی تک لے جاؤ۔ میں اس میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

”ناصر تم ایسا کرو کہ گاڑی اس جھونپڑے کے پیچھے لے آؤ تاکہ کسی کی نظر اس گاڑی پر نہ پڑے۔“ خرم نے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ ناصر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جھونپڑے کے پیچھے اس طرح کھڑی کر دی کہ سڑک سے اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دونوں لڑکیاں کار کی پچھلی سیٹ جبکہ دونوں لڑکے آگے بیٹھ گئے۔

”میرا نام ردا ہے۔ یہ ناصر اور خرم ہے۔“ ردا نے تعارف کرایا۔

”مجھے عینی کہتے ہیں۔“ عینی نے اپنا نام بتایا۔

”تمہیں کس نے اغوا کیا تھا؟“ ردا نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“ عینی نے مختصر جواب دیا۔ ”کیا آپ لوگ میری مدد کریں گے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ بولو تم کیا چاہتی ہو؟“ ردا نے کہا۔

”میں اپنے گھر فون کرنا چاہتی ہوں۔“ عینی بولی۔

اس کی بات سن کر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ردا نے جواب دیا۔ ”ہم تینوں کے پاس فون نہیں ہے۔“

”یہاں سے چلو۔ کسی جگہ سے بھی کال کر کے فون کر لیں گے۔“ عینی بولی۔

”ہم کار یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس کار کی وجہ سے ہم پکڑے نہ جائیں۔“ خرم نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

”یہ کار میرے نام رجسٹرڈ ہے۔ ڈیش بورڈ میں اس کے کاغذات موجود ہیں۔“ عینی نے کہا۔

خرم نے ڈیش بورڈ کھولا تو وہاں گاڑی کے کاغذات موجود تھے۔ ”کاغذات تو موجود ہیں۔“

”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی پی سی او پر جا کر میں اپنے ڈیڈی کو فون کرتی ہوں۔ وہ شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ہماری مدد کو وہ فوراً آ جائیں گے۔“ عینی نے کہا۔

ناصر اور خرم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ناصر نے اشارہ پا کر کار اسٹارٹ کر دی۔ کار ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆......☆......☆

شمس الدین کمرے میں یوں ٹہل رہا تھا جیسے کچھ کہنے کے لئے بے چین ہو۔ اس نے اپنی بیوی درخشاں بیگم کی طرف کئی بار دیکھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت ٹوٹ جاتی اور وہ پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ شمس الدین ایک بار پھر کچھ کہنے کی تیاری میں تھا کہ درخشاں بیگم نے اس کی بے چینی کو بھانپ کر خود ہی پوچھ لیا۔ ”شمس تم بہت بے چین ہو۔ تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں؟ میں ملازم کو بلاؤں؟“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ شمس بولا۔

”پھر بیٹھ جاؤ۔ میں جانتی ہوں یہ وقت ہمارے لئے بہت کٹھن ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ درخشاں بیگم کا چہرہ اداس ہو گیا تھا۔

”درخشاں میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ [illegible]

”کیا کہنا چاہتے ہو شمس؟“

شمس الدین بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ درخشاں بیگم کی طرف تھا۔ ”تم جانتی ہو کہ میرا وسیع کاروبار ہے۔ [illegible] کروڑوں روپیہ اس وقت مارکیٹ میں پھنسا ہے۔ [illegible] اس کے لئے مجھے کسی ایسی طاقت کی ضرورت تھی جس کا نام دوسروں کے لئے خوف کا باعث ہو۔“ شمس الدین نے کہنا شروع کیا۔ ”میری نظر میں ایک ہی آدمی تھا جس کی دہشت سے ہر کوئی واقف ہے اور وہ سکندر تھا۔“

”اوہ۔“ درخشاں بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔

[illegible]

☆......☆......☆

سکندر نے سوچا کہ اس سے واقعی غلطیاں ہوئی ہیں کہ اس نے شمس الدین کو وقت بے وقت تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے اپنے پھل پکنے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ [illegible] شمس الدین اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دے۔ [illegible] سکندر نے اپنی غلطی تسلیم کی اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب شمس الدین کی عقل ٹھکانے آ جائے۔“

سکندر نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر چپ چاپ گھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

سکندر سیدھا شمس الدین کے گھر پہنچ گیا۔

شمس الدین اور درخشاں بیگم اچانک سکندر کو دیکھ کر چونک گئے اور حیرت بھی ان کے چہروں پر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سکندر پہلے تو عینی کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ شمس الدین سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا ہو جس کی پاداش میں عینی کو اغوا کیا گیا ہو۔ شمس الدین نے سوچ بچار کے بعد جواب نفی میں دیا تو اچانک سکندر نے پوچھا۔ ”جب عینی اغوا ہوئی تھی تو اس کے ساتھ کون تھا؟“

سکندر کا سوال سن کر شمس الدین نے ایک لمحے کے لئے اپنا گلا صاف کیا اور پھر بولا۔ ”عینی اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی تھی اور اس کی موجودگی میں عینی کو اغوا کیا گیا تھا۔“

”کیا نام ہے اس لڑکی کا؟“ سکندر نے اگلا سوال کیا۔

”اس کا نام تو کچھ اور ہے لیکن عینی نے اسے ایک نام دیا تھا۔ حالانکہ گھر والے اسے کبھی اس نام سے نہیں پکارتے۔“

”پھر آپ اس کا اصل نام بتادیں۔“ سکندر بولا۔

اس بار درخشاں بیگم نے جواب دیا۔ ”اس کا نام نادیہ ہے۔“

”نادیہ۔“ سکندر نے نام دہرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شمس الدین نے جلدی سے پوچھا۔ ”عینی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟“

”اس کے بارے میں بہت جلد پتا چل جائے گا۔“ سکندر نے شمس الدین کی طرف دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ کچھ کہنا اور جانتا تھا لیکن آخری لمحے اس نے اپنا جملہ بدل دیا ہو۔

”ہمیں بہت فکر ہو رہی ہے۔“ درخشاں بیگم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے آپ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سکندر نے کہا۔

”جانے میری بچی کس حال میں ہو گی۔“ درخشاں بیگم پریشانی کے عالم میں خود سے بولی۔

سکندر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ عورت بھی اچھی اداکاری کرتی ہے۔ پھر وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

سکندر روڈی میں سیدھا حسن کے ساتھ نادیہ کے گھر چلا گیا۔ ایک پولیس والے کو گھر کے دروازے پر دیکھ کر نادیہ کا باپ پریشان ہو گیا۔

”جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ نادیہ کا باپ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ ”میں سکندر ہوں۔“

”مجھے آپ کی بیٹی نادیہ سے ملنا ہے۔“ سکندر بولا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ نادیہ کا باپ مزید گھبرا گیا۔

”اس کی دوست عینی کو اس کی موجودگی میں اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے اس بارے میں اس سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”اس بارے میں تو اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ [illegible] ”عینی کب اغوا ہوئی؟“

نادیہ کے باپ کی یہ بات سن کر سکندر کو خاصی حیرت ہوئی۔ ”آپ کو نہیں معلوم؟“ سکندر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

مجبوراً اس کے باپ نے نادیہ کو بلایا۔ نادیہ جو بھی کچھ تھا وہ ایک ایسا تاثر تھا جس کو سکندر پہچان گیا۔ وہ ڈرتے ہوئے آ کے کھڑی ہو گئی۔ سکندر کا یہ اندازہ درست تھا کہ نادیہ عینی کی بہت قریبی دوست ہے۔ سکندر نے کہا دونوں کو بھی شریک کیا جائے۔ [illegible] سکندر بالکل نہیں جانتا تھا کہ نادیہ اس کی منگیتر کی سب سے قریبی دوست ہے۔ نادیہ ڈری سی سکندر کے سامنے آئی۔

سکندر نے پہلے اس کا جائزہ لیا اور موازنہ کرنے لگا کہ نادیہ زیادہ خوبصورت ہے یا عینی۔ اسے لگا کہ عینی سے زیادہ نادیہ خوبصورت ہے۔ [illegible] ”آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ جب عینی کو اغوا کیا گیا تھا کیا آپ اس کے ساتھ تھیں؟“

”جی ہاں۔“ نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ سارا واقعہ کیسے رونما ہوا تھا؟“

جواب میں نادیہ نے واقعہ بیان کر دیا۔ سکندر اس کی بات پر غور سے سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔

”پھر آپ نے کیا کیا؟“ جب نادیہ چپ ہوئی تو سکندر نے اگلا سوال پوچھا۔

”میں گھر آ گئی اور انکل کو اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں ابھی اس بات کا ذکر کسی سے نہ کروں۔“

”پھر آپ نے کسی سے ذکر نہیں کیا؟“

”جی۔“

”اپنے گھر والوں سے بھی نہیں؟“

”بالکل نہیں۔“

”میں نے سنا ہے آپ عینی کی قریبی دوست ہیں بلکہ آپ دونوں ایک دوسرے کی رازداں بھی ہیں۔ کوئی ایسی بات جو تم سے عینی نے کی ہو یا کوئی اس کے دل کی بات جو وہ صرف تم سے کر سکتی تھی؟“ سکندر نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

نادیہ سوچنے لگی کہ اس کے سامنے کیا کہے۔ دونوں ایک دوسرے کی رازداں تو تھیں۔ دونوں کے سینوں میں ایک دوسرے کی ڈھیروں باتیں دفن تھیں لیکن سکندر ایسی کون سی بات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ [illegible]

سکندر بہت شاطر آدمی تھا۔ وہ جو جاننا چاہتا تھا وہ سب کچھ جان گیا تھا کہ عینی کو اغوا کرنے کا منصوبہ اس نے خود بنایا تھا۔ [illegible] عینی کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ [illegible] چہرے کی معصومیت نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

سکندر کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی [illegible] سکندر کی زندگی کا اصول تھا کہ وہ نفرت کا بدلہ ضرور لیتا ہے۔ [illegible] وہ زندگی بھر یاد رکھ سکے۔

سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک بات آئی اور پھر اس بات کو سارا روشن خان سے جاملا۔ سکندر نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور کار میں بیٹھ کر سیدھا روشن خان کی طرف چل پڑا۔ اس کی کار کی رفتار غیر معمولی تھی۔

☆......☆......☆

روشن خان کے لئے یہ بات بڑی حیرت کا باعث تھی کہ اس کے سامنے سکندر براجمان تھا اور وہ بھی اکیلا۔ وہ اس وقت اسلم کو بلا کر سکندر کے ساتھ جو سلوک کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے قبل یہ جاننا ضروری سمجھا کہ سکندر کس نیت سے آیا ہے۔

”تمہارے دل میں کافی خیال آ رہے ہیں۔ ایک بار اس کی بات سن لو۔“ سکندر نے کہا۔ ”میں تم سے صلح کرنے آیا ہوں۔“

”کیوں اور کیسی صلح؟“ روشن خان بولا۔

”یوں سمجھو تم میری دوستی چاہتے ہو۔“ سکندر نے مسکرا کر کہا۔ روشن خان نے ملازم کو بلایا اور اسے کافی لانے کا حکم دیا۔

”کیوں مل سکتی ہے۔“ روشن خان نے کہا۔

”تمہاری دوستی کی قیمت کیا ہے؟“ روشن خان نے پوچھا۔

”تو سال پہلے تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اسے تم بھول جاؤ۔ وہ سب پہلے کی بات ہے۔“ سکندر بولا۔

”وہ باتیں میں کیسے بھول سکتا ہوں؟“ روشن خان نے فوراً جواب دیا۔ ”تمہاری وجہ سے میرا نقصان ہوا تھا۔“

”ہماری دوستی مثالی رہی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔“ روشن خان بولا۔

”میں اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔“ سکندر بولا۔

”کیسا اعتراف؟“ روشن خان نے پوچھا۔

”میرے دل میں کھوٹ آ گیا تھا۔ جب تمہاری بہن میں تمہاری بہن کے حسن کے سحر میں مبتلا ہو گیا تھا اور اسے پانے کی خواہش میں اپنی دوستی کی لاج بھی نہ رکھ سکا اور اسے حاصل کرنے کے لئے سوچنے لگا۔“

سکندر نے برملا اعتراف کر لیا۔ روشن خان کو سکندر کی یہ بات بڑی حیران کن لگی تھی۔

”یہ سب پرانی باتیں ہیں۔“ روشن خان نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں اب احساس ہوا تو سارے کام چھوڑ کر تمہارے پاس آ گیا۔ سوچا اعتراف کر لوں اور تم سے معافی بھی مانگ لوں۔ اور یہ بات جانتے ہو کہ میری زندگی کی ڈکشنری میں کسی انسان سے معافی مانگنا نہیں لکھا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“ روشن خان کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ [illegible]

”یہ بات ہے بھی کچھ۔“ روشن خان بولا۔

”جسم کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کون روک سکتا ہے۔“

”جب تم اسپتال میں تھے تو میں نے فون کر کے پوچھا تھا۔ تم کیسے ہو؟ کیا تم مجھ سے چھیننا چاہتے ہو؟“

روشن خان کو اس بات پر ہنسی آ گئی۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”پھر تم اس پر پچھتاؤ گے۔ ویسے یہ بات تم کیوں بھول گئے؟“

”میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔“

سکندر اپنے گھر کے معاملات کو سامنے رکھ کر خاموش ہو گیا۔ اس دوران ملازم کافی لے آیا۔ روشن خان نے ایک کپ اٹھایا اور کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔

”سکندر کیا تم ساری باتیں بھلا کر صاف دل سے دوستی کرنا چاہتے ہو یا یہ کوئی چال ہے؟“

”سکندر کبھی کسی سے معافی نہیں مانگتا۔“ سکندر نے کہا۔

”تو آؤ آج ہم اور تم پھر سے بھلا کر ایک دوسرے کے دوست بن جائیں۔“ روشن خان نے کہا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ دونوں نے اپنے دل صاف کر لئے اور دونوں پھر دوست بن گئے۔ [illegible]

باتوں باتوں میں روشن خان کو پتا چل گیا کہ سکندر کے ساتھ دراصل معاملہ کیا تھا۔ [illegible]

”یہ بڑا کیا ہے۔ اس نے بہت برا کیا ہے۔“

”اب میں کیا کر سکتا ہوں؟“ روشن خان بولا۔

”تم بس میرا ایک کام کرنا۔“ [illegible]

”میرا ساتھ دو۔“

”تم مجھے بتاؤ۔“

”تم بس وہی کرو کہ یہ جو مجھ پر الزام لگاتا ہے، وہ غلط ہے۔“ روشن خان بولا۔

”ایسا ہی ہوگا۔“

”تم مجھے بتاؤ کہ نادیہ کون ہے اور اسے کب اغوا کرنا ہے۔“

روشن خان نے پوچھا۔

”بس تم میرا انتظار کرو۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔ فی الحال میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ میں ان تینوں کی تلاش میں نکل رہا ہوں۔“

سکندر نے اجازت لی اور روشن خان کے گھر سے نکل گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ دوستی کر کے خوش اور مطمئن تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طاقت بن گئے تھے۔

☆......☆......☆

ایک دھماکا ہوا اور کار کا ٹائر پھٹ گیا۔ کار یکدم بے قابو ہو گئی۔ ناصر نے بمشکل کار کو سنبھالا اور سڑک کے ایک جانب روک لیا۔

”ٹائر کیسے پھٹ گیا۔“ خرم نے فوراً گردن پیچھے کی طرف گھمائی۔

”تمہارا خیال ہے کہ کسی نے فائر کیا ہے؟“ ناصر نے متلاشی نگاہوں سے پیچھے دیکھا۔

”مجھے ایسا لگا تھا۔“ خرم نے کہا۔

”شہر ابھی دور ہے۔“ عینی نے فکر مندی سے بولی۔

”شہر چار، پانچ کلو میٹر دور ہو گا۔“ [illegible]

”یہ کب سے پنکچر ہے؟“ ناصر نے عینی سے پوچھا۔

[illegible]

شہر آ گیا تھا۔ راستے میں ہی خرم نے کار ڈرائیو کرنے والے سے ایک کال کرنے کے لئے جب اس کا موبائل فون مانگا تھا تو اس نے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”فون میں بیلنس نہیں ہے۔“

وہ آدمی پہلے ہی انہیں اپنی کار میں لفٹ دے کر اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ انہیں اپنی کار میں بٹھا لیا۔ جانے یہ کون لوگ ہیں؟

موبائل فون نہ ملنے پر پھر کسی کی بولنے کی ہمت نہیں رہی۔ وہ چاروں چپ چاپ شہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ شہر پہنچ کر ہی اب فون ہو سکتا تھا۔

جونہی کار شہر کے اندر داخل ہوئی اور اس آدمی نے کار روک دی اور بولا۔ ”مجھے اس طرف جانا ہے۔ آپ اتر جائیں۔“

چاروں کو اس جگہ اترنے میں کوئی عار نہ تھا۔ وہ کار سے باہر نکلے اور عینی کی متلاشی نگاہیں کسی پی سی او کو دیکھنے لگیں۔ کچھ فاصلے پر ردا کو پی سی او دکھائی دے گیا۔ وہ چلائی۔ ”وہ رہا، وہ دیکھو۔“

عینی کے ساتھ دونوں نے اس طرف دیکھا اور پھر چاروں اس طرف چل پڑے۔ عینی نے پی سی او والے سے موبائل فون لے کر اپنے ڈیڈی کا نمبر ملایا اور ملنے کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد شمس الدین کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

”ڈیڈی میں بول رہی ہوں عینی۔“ عینی نے جلدی سے کہا۔

”عینی تم کہاں ہو؟“ شمس الدین اس کی آواز سنتے ہی یکدم چونکا۔

”میں اس وقت......“ عینی نے دکاندار سے پوچھا اور جگہ کا نام بتا دیا۔

”تم اسی جگہ رکو۔ میں نے جگہ کا نام لکھ لیا ہے۔ کوئی قریبی نشانی بتاؤ تاکہ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔“

عینی نے باہر کی طرف جھانکا۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک ریسٹورنٹ دکھائی دیا۔ وہ اس علاقے کا کوئی مشہور ریسٹورنٹ لگتا تھا۔ اس کا بڑا سا بورڈ تھا جس پر ریسٹورنٹ کا نام لکھا تھا اور ساتھ اس بازار کا نام بھی لکھا تھا جہاں وہ ریسٹورنٹ واقع تھا۔ عینی نے ریسٹورنٹ اور بازار کا نام بتا دیا۔ دوسری طرف شمس الدین سب ایک کاغذ پر لکھ رہا تھا۔

”تم ایسا کرو کہ اس ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھو۔ میں خود تمہیں لینے کے لئے آتا ہوں۔“ شمس الدین نے ہدایت کی۔

”ٹھیک ہے ڈیڈی، آپ جلدی آ جائیں۔ ہم اس ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔“ عینی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور پھر باہر آ کر انہیں بتایا کہ اس کے ڈیڈی نے کیا کہا ہے۔

”چلو کچھ کھا پی لیتے ہیں۔“ ناصر بولا اور چاروں اس ریسٹورنٹ کی طرف چلے گئے۔

☆......☆......☆

شمس الدین نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو فون کیا کہ وہ عینی کی تلاش چھوڑ کر واپس آ جائیں۔ شمس الدین نہیں چاہتا تھا کہ اس کے آدمی عینی تک پہنچ جائیں اور عینی انہیں دیکھ کر بھاگ جائے۔

شمس الدین نے اپنا کوٹ پہنا اور خود ہی کار ڈرائیو کرتے ہوئے عینی کو لانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بیوی درخشاں بیگم بھی جانے پر بضد تھی۔

شمس الدین نے سمجھایا۔ ”تم گھر میں رہو تو اچھا ہے۔ میری غیر موجودگی میں اگر سکندر آ جائے تو تم معاملہ سنبھال سکو گی۔“

”آپ عینی کو یہاں لے کر آئیں گے؟“ درخشاں بیگم نے پوچھا۔

”میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ میں عینی کو کار میں ہی ساری حقیقت بتا دوں گا۔ میں اس سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔“

”عینی کو سب کچھ بتانا مناسب رہے گا؟“ درخشاں بیگم سوچتی ہوئی بولی۔

”تو پھر کیا کریں؟“

”اگر آپ اسے یہ بتائیں گے کہ اسے آپ نے اغوا کرایا تھا تو عینی کا دل آپ سے برا نہ ہو جائے۔“ درخشاں بیگم کو کچھ اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

”عینی کو حقیقت تو بتانی پڑے گی۔“

”پھر آپ بات گھما دیں۔ ہمارا مقصد حل ہو جائے گا۔“ یکدم درخشاں بیگم ایک خیال سے چونکی۔ ”آپ عینی کا اغوا سکندر کے سر پر ڈال دیں اور عینی کو بتائیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے اور سکندر ہم سے کیا مفاد اٹھا رہا ہے۔“

درخشاں بیگم کی بات سن کر شمس الدین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ درخشاں بیگم نے ٹھیک کہا تھا۔ اس سے وہ سکندر کے بارے میں عینی کے دل میں مزید زہر بھرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ بہترین حل ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ میں چلتا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔“ شمس الدین نے وہ پرچی جس پر اس نے اس ریسٹورنٹ اور بازار کا نام لکھا تھا، اپنی جیب میں رکھی اور دروازے کی طرف بڑھا۔

قدموں کی آواز سنتے ہی دروازے کے ساتھ لگا ان کا ملازم اور سکندر کا نمک حلال ایک دم پیچھے ہٹا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

اس ملازم کو یہ پریشانی تھی کہ وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ عینی کس جگہ اپنی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ سکندر کو اطلاع دینے کی جلدی میں اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور اس کا نمبر ملا کر موبائل فون اپنے کان کو لگا لیا۔ تھوڑی دیر میں رابطہ ہو گیا۔ ملازم اسے ساری بات بتانے لگا۔

ملازم کا منہ دوسری طرف تھا اور جلدی میں وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس نے کمرے کا دروازہ ٹھیک سے بند بھی کیا تھا کہ نہیں۔ اس تھوڑے سے کھلے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے شمس الدین نے ملازم کا وہ جملہ سن لیا جو وہ سکندر سے کہہ رہا تھا۔

”عینی جس جگہ ہے وہ جگہ شمس صاحب نے پرچی پر لکھی تھی۔ وہ پرچی ان کی جیب میں ہے، کیونکہ میں دروازے کی، کی ہول سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ عینی اس وقت کہاں ہے۔ شمس صاحب اسے اکیلے ہی لینے جا رہے ہیں۔“

شمس الدین کے قدم اسی جگہ جم گئے تھے۔ اس کے لئے یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ ان کا ملازم فون کر کے کس کو یہ اطلاع دے رہا ہے۔ ملازم کی پھر آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور موبائل فون اپنی جیب میں رکھنے کے بعد جونہی گھوما، اس کی نظر ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چونکا کہ اسی دروازے کے سامنے سے گزر کر شمس الدین کو جانا تھا۔ کیا وہ چلے گئے؟

ملازم نے آہستہ سے اپنا قدم دروازے کی طرف بڑھایا اور اسے مزید کھول کر جونہی باہر جھانکا، سامنے شمس الدین کھڑا تھا۔ ملازم کے منہ سے ڈر کے مارے چیخ سی نکل گئی۔

”کسے فون کر رہے تھے؟“ شمس الدین نے متانت سے پوچھا۔

”کسی کو بھی نہیں۔“ ملازم نے کہا۔

”میں نے خود سنا ہے۔ تم کسی کو فون کر کے عینی کے بارے میں اطلاع دے رہے تھے۔ بتاؤ کسے فون کر رہے تھے تم؟“ شمس الدین کا لہجہ تیز ہوا تو درخشاں بیگم بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔

دونوں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہوا شمس؟“

”یہ کسی کو ہماری باتیں بتا رہا تھا۔“ شمس بولا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس تو فون ہی نہیں ہے۔ میں بھلا کس سے بات کروں گا۔“ ملازم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ دراصل سکندر نے اسے دوسری طرف سے یہ ہدایت کی تھی کہ کسی طرح شمس الدین کو گھر میں دس پندرہ منٹ کے لئے روک لو، وہ سیدھا یہیں آ رہا ہے۔ شمس الدین کی جیب سے پرچی وہ خود نکلوا لے گا۔ ملازم روکنے کے لئے شاید کوئی اور طریقہ یا بہانہ اختیار کرتا، اب اسے اس صورت میں موقع میسر آ گیا تھا۔ وہ شمس الدین کو الجھا کر سکندر کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر اعتماد کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ سکندر کچھ نہیں بگڑنے دے گا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“ شمس الدین نے درشت رویہ اپنایا۔

”میری تلاشی لے لیں۔“ ملازم نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیئے۔

شمس الدین اس کی تلاشی کے لئے آگے بڑھا تو ملازم ہوشیاری سے بولا۔ ”دیکھیں صاحب، میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ اگر میری کسی جیب سے موبائل فون نہ نکلا اور میں سچا ثابت ہوا تو پھر میں یہاں نوکری نہیں کروں گا، اسی وقت چلا جاؤں گا۔“

”یہ بعد میں دیکھیں گے، پہلے تم مجھے تلاشی دو۔“

”بیگم صاحبہ، دیکھ لیں صاحب مجھ پر ناجائز شک کر رہے ہیں۔“ ملازم چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ شمس الدین اس کی تلاشی لے، سکندر آ جائے۔

”تم تلاشی دے دو۔“ درخشاں بیگم کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

”آپ بھی مجھ پر شک کر رہی ہیں۔“ ملازم نے رونے والی صورت بنالی جیسے وہ واقعی بے گناہ ہو۔

”تم کسی کو ہمارے گھر کی باتیں بتاتے ہو۔ چپ چاپ مجھے تلاشی دو۔“ شمس الدین آگے بڑھا اور اسی اثنا میں باہر تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔

”یہ کون آیا ہے۔“ درخشاں بیگم تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ ملازم کو حوصلہ ہو گیا کہ سکندر آ گیا ہے۔

درخشاں بیگم کھڑکی سے ہٹی۔ ”باہر سکندر کی گاڑی کھڑی ہے۔“

”سکندر......؟“ شمس ایک دم چونکا۔ پھر اس کے ذہن میں اسی وقت یہ بات آئی کہ اس ملازم کو سکندر نے ہی رکھوایا تھا۔ یہ سکندر کو تو فون نہیں کر رہا تھا؟ ”تم نے ابھی سکندر کو فون کیا تھا؟“

”نہیں۔“ ملازم نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔

”چوکیدار نے گیٹ کھول دیا ہے؟“ شمس نے پوچھا۔

”ہاں سکندر گاڑی سے نکل رہا ہے۔“ ایک بار پھر درخشاں بیگم نے کھڑکی سے باہر جھانک کر بتایا۔

”اس نے سکندر کو ہی فون کیا تھا۔ یہ اسی کا آدمی ہے۔ میرے دماغ میں اس وقت اور بھی باتیں آ رہی ہیں۔ کڑی سے کڑی مل رہی ہے۔“ شمس مضطرب ہو گیا اور اس نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور میز پر پڑا پتھر کا گلدان بجلی کی سی تیزی سے اٹھایا اور ملازم کے سر پر دے مارا۔

ملازم اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اچانک گلدان سر پر پڑنے سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ اتنا صحت مند نہیں تھا کہ اس وار کو آسانی سے برداشت کر سکے۔ وہ چکرا کر نیچے گر گیا۔ اس اثنا میں شمس نے ایک اور حملہ کر دیا اور وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔

”ساتھ والے اسٹور سے رسی لے کر آؤ، جلدی۔“ شمس بولا۔ درخشاں بیگم باہر کی طرف بھاگی اور شمس اسے گھسیٹ کر کمرے میں موجود صوفے کے پیچھے لے گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سکندر لاؤنج میں پہنچ چکا تھا۔

سکندر نے ملازم سے پوچھا۔ ”صاحب کہاں ہیں؟“

”جی وہ اسٹڈی روم میں ہیں۔ انہیں اطلاع کروں؟“ ملازم نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

سکندر نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور اوپر جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

اوپر درخشاں بیگم رسی لے کر آئی تب تک شمس ملازم کے منہ میں کپڑا ٹھونس چکا تھا۔ اس نے درخشاں بیگم سے رسی لی اور بولا۔ ”تم اسٹڈی روم میں چلی جاؤ اور دروازہ اچھی طرح سے بند کرتی جانا۔ وہ یقیناً سیدھا اسٹڈی میں آئے گا اور میرا پوچھے تو کہہ دینا کہ میں باتھ روم میں ہوں۔“

درخشاں سنتے ہی چلی گئی اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ شمس الدین نے ملازم کے ہاتھ اچھی طرح سے باندھے اور پھر اس کے پیر باندھ کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب سے اس کا موبائل فون مل گیا۔ اس نے عجلت میں فون کے نمبر دیکھے۔ آخری کال سکندر کے موبائل پر ہوئی تھی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ فون کی بیل پہلے ہی بند تھی۔

شمس نے فون الماری میں رکھا۔ ایک کپڑے سے فرش پر خون کے دھبے صاف کئے اور سب کچھ ٹھیک کرنے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ملازم بڑے صوفے کے پیچھے تھا، یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ملازم کو باندھ کر اس صوفے کے پیچھے لٹایا گیا ہے۔

باہر نکلنے سے قبل اچانک شمس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا تو اس کے ہاتھ میں پرچی آ گئی جس پر ریسٹورنٹ کا نام لکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے پرچی نکال کر اس نے کچھ سوچا اور پھر پرچی جیب میں ڈال لی۔

شمس الدین نے سوچا کہ وہ عینی کے پاس جانے کے لئے نکل جائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو سکندر اس کی بیوی کو بھی نقصان نہ پہنچا دے۔ جانے کب سے وہ اس ملازم کے ذریعے اس گھر کا بھید لے رہا تھا اور معلوم نہیں کہ سکندر نے ان کی کیا کیا باتیں سن کر سکندر کو بتائی ہوئی تھیں۔

شمس الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دیر سکندر کے پاس رکنے کے بعد وہاں سے جلدی نکلنے کی کوشش کرے گا۔ شمس الدین دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے جائے یا نہ جائے۔ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

(جاری ہے)

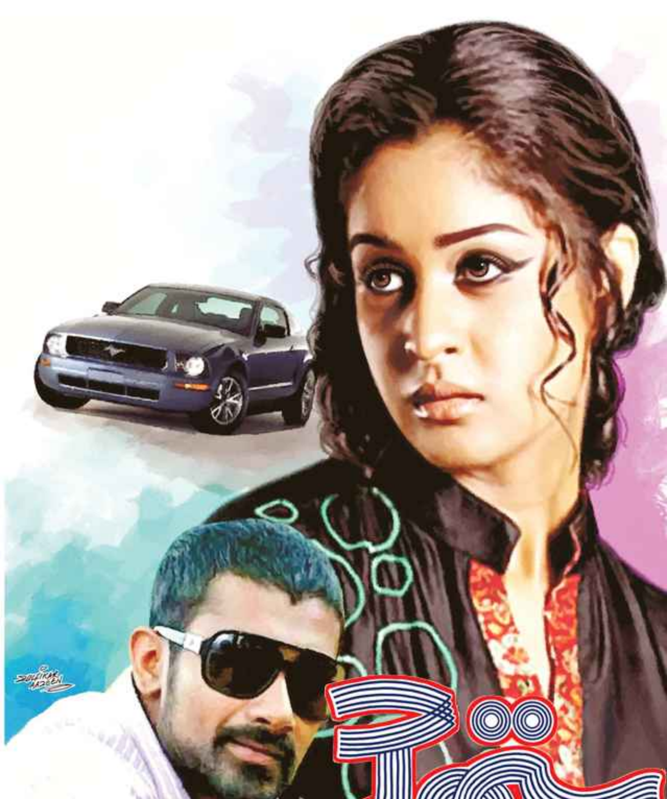

محمد فاروق انجم

قسط : 9

شمس الدین کچھ دیر دروازے کا ہینڈل پکڑے سوچتا رہا کہ کیا کرے؟ آخر کار اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ وہ کچھ دیر کے لیے سکندر کے پاس چلا جائے۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے اسٹڈی روم میں [illegible] سکندر [illegible] دروازہ کھلنے پر سکندر نے گردن گھما کر شمس الدین کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ [illegible] کیا آپ کا بیٹی کی خاطر کسی خاص منصوبہ بنایا ہے۔ کیا آپ کا بیٹی سے کوئی رابطہ ہوا انہوں نے کوئی آپ کو فون کیا؟"

"بیٹا تم یہ بات فون کر کے پوچھ لیتے؟" شمس الدین اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ [illegible] سکتا تھا۔" سکندر بولا۔

[illegible]

"آپ جیسے گھر کے کوئی کام کرتے ہیں۔" سکندر جلدی سے بولا۔

[illegible]

"ہیلو" [illegible]

[illegible]

"کس نے فون کیا ہے؟" سکندر نے پوچھا۔

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

"کہاں چلیں؟" [illegible]

"سکندر آگیا۔" خرم سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

[illegible]

"ہاں۔"

"مجھے فون کر دیتے۔"

[illegible]

"کہاں جا رہے ہو؟" خرم نے پوچھا۔

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

"تم ابھی تک یہیں ہو؟" [illegible]

[illegible]

"کہاں ہے؟" سکندر نے پوچھا۔

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

"کہاں جا رہے ہو؟"

[illegible]

"مجھے بھی لے چلو۔"

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

"کیا مطلب؟"

[illegible]

(جاری ہے)

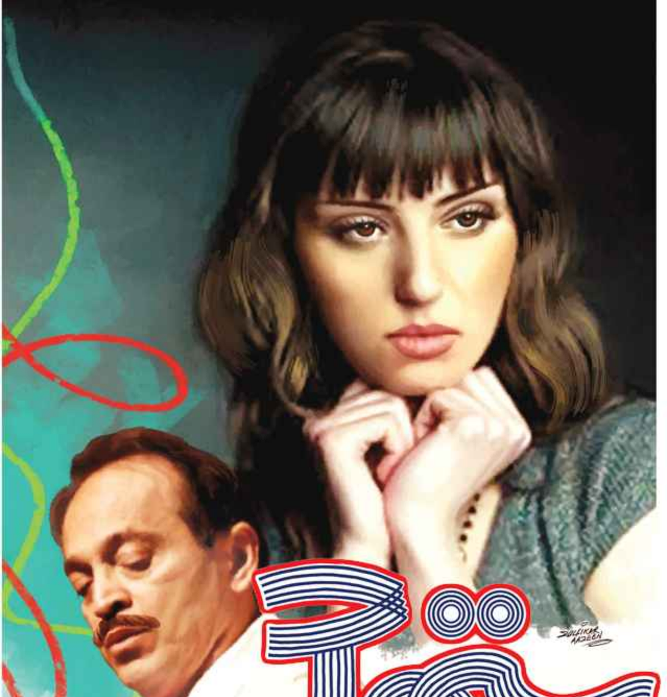

محمد فاروق انجم

قسط : 10

روا نے اس کی طرف چونک کر دیکھا اور بولی۔ "میں کچھ بھی سوچ سکتی ہوں۔ میرے سوچنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے نا۔"
"ان ہی اداؤں نے تو مجھے پاگل بنایا ہے۔" روشن خان ہنسا۔
"آپ کو ان اداؤں نے نہیں، آپ کی دولت نے پاگل کیا ہے۔" روا برملا بولی۔
روشن خان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ چاہتا تھا کہ اپنے دل کی بات اپنی زبان کی نوک پر لا کر روا کو گھائل کر دے لیکن اسے اپنے لہجے کی مٹھاس کو معدوم کرنے کی بجائے اسے برقرار رکھنے میں ہی فائدہ نظر آیا۔ "اس گھر میں ملازموں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ان میں سے کسی کی جرأت نہیں کہ وہ اس دروازے سے اندر قدم رکھ سکیں۔ صبح ایک آدمی کھانے پینے کا سامان دروازے کے پاس رکھ کر چلا جائے گا۔ تم وہ سامان اٹھا کر کچن میں رکھ کر اپنی مرضی سے جو چاہو پکا کر کھا لینا۔ میں اپنے ایک اہم کام کے سلسلے میں چار دن کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ چار دن کے بعد ملاقات ہوگی۔" روشن خان کہہ کر پلٹا اور چلتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ روا نے اسے جاتے ہوئے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ دوسری طرف منہ کئے کھڑی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔
روشن خان نے باہر نکل کر اپنے تینوں بدمعاش طرز کے ملازموں کو بلایا اور کچھ ہدایت دینے کے بعد کہا۔ "دونوں کتوں کو کھلا چھوڑ دو۔ باؤنڈری وال کے گرد گھومتے رہنا۔ نہ کوئی اندر آئے نہ کوئی باہر جائے ورنہ تم تینوں کے ساتھ بہت برا ہوگا۔"
روشن خان یہ کہہ کر اپنی کار میں بیٹھا اور باہر نکل گیا۔ فارم ہاؤس کا گیٹ بند ہو گیا۔

☆.........☆.........☆

سکندر نے نادیہ کے باپ نذیر احمد کو اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اپنی پولیس کو گاڑی کا حوالہ دے کر پیچھے بھیجا۔ وہ تین جگہ اس سلسلے میں فون کئے اور پھر خرم سے اس کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی اور نذیر احمد کو طفل تسلیاں دے کر گھر روانہ کر دیا۔
اس کے جاتے ہی سکندر نے ایک پرسکون سانس لی اور اپنے آپ سے کہا۔ "سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ ایک بہترین جال بن لیا ہے میں نے، اور اب اس جال میں کون کون آئے گا یہ میرے اختیار میں ہے۔"
پھر اس نے پانی پیا اور اپنے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائی۔ وہ بہت مسرور تھا۔ بالکل ایسے جیسے بازی جیتنے کے لئے سارے پتے اس کی انگلیوں میں دبے ہوں۔ سکندر نے گھڑی میں وقت دیکھا اور بڑبڑایا۔ "اب تک اکبر کو آ جانا چاہئے تھا۔"
اس نے ایک فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا لیکن اس کا دھیان اکبر کی طرف تھا۔ اس کی منتظر نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ پھر اچانک دروازہ کھلا اور اکبر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی سکندر نے فائل بند کر دی۔
"تم نے اتنی دیر لگا دی۔ کہاں رہ گئے تھے؟"
"میں نے روا کو روشن خان کے فارم ہاؤس پہنچا دیا ہے۔" اکبر نے بتایا۔
"اچھا کیا۔ یہ کام بھی ختم ہوا اور وہ کہاں ہے ناصر؟"
"آتے ہوئے میں پنکچر ہو گئی تھی۔ ہم ٹائر بدل رہے تھے کہ اس دوران وہ نظر بچا کر بھاگ گیا۔" ناصر بولا۔
"کیا......؟" سکندر کو ایک جھٹکا لگا۔ "ناصر بھاگ گیا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"مجھے افسوس ہے لیکن ایسا ہی ہوا تھا۔" اکبر پریشان ہو گیا تھا۔
"اکبر میں تم سے ایسی امید نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے ساتھ ایک عرصے سے کام کر رہا ہوں۔" سکندر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پتا نہیں اچانک اسے فرار کا کیسے موقع مل گیا۔ ہم نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کے پیچھے بھی بھاگے لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔" اکبر کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے ناصر کے فرار کا سخت رنج ہے۔ اس کی آنکھوں میں ندامت تھی۔
"تم نے میرے ہاتھ کا ایک کارڈ کم کر دیا۔" سکندر سوچتے ہوئے بولا۔
"میرے آدمی اس کی تلاش میں ہیں۔" اکبر نے تسلی دی۔
سکندر مضطرب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تلاش کرنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شہر چھوڑ دے۔ پہلے وہ تین تھے، اب وہ علیحدہ ہو گئے ہیں۔ روا، روشن خان کے پاس چلی گئی ہے اور وہ دونوں فرار ہو گئے ہیں۔" سکندر کو غصہ آ رہا تھا لیکن وہ اکبر پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کا قابل اعتماد آدمی تھا۔
"میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔" اکبر نے کہا۔
"نہیں اب کوئی فائدہ نہیں۔" سکندر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "اچھا چلو تم ایک کوشش کر کے دیکھ لو اسے شہر میں ہر جگہ تلاش کرو۔ اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔"
"میں چلتا ہوں سر۔" اکبر کمرے سے باہر نکل گیا اور سکندر تلملاتا رہ گیا۔
اکبر نے جونہی سکندر کے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کیا، اس کے ہونٹوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ عیاں ہوئی اور وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ وہ مسکراہٹ اس جگہ معدوم ہوئی جہاں اس کا اسٹاف بیٹھا تھا۔
اس نے اپنی مرضی سے چند پولیس اہلکار لئے اور وین میں بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔
مسکراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے سکندر کے ساتھ ایک ڈرامہ کر دیا تھا۔ جب وہ روا کو روشن خان کے فارم ہاؤس چھوڑ کر واپس جا رہا تھا تو اس کے دماغ میں اچانک ایک خیال آیا کہ اسے کب تک سکندر کی غلامی کرتا رہے گا اور سکندر اس کے ذریعے پیسہ اکٹھا کرتا رہے گا؟ سکندر بس کچھ پیسے اس کی طرف بڑھا دیتا ہے اور پھر ایک نئی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔
سکندر جو ناصر کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اس کا اکبر کو علم تھا۔ ایک بار پھر پیسے کا رخ اس کی طرف ہونے والا تھا۔ اکبر نے سوچا کیوں نہ وہ اس اہم مہرے کو اپنے قبضے میں کر کے اس کی قیمت وصول کرے۔
وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ناصر کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کرے کہ وہ سکندر تک نہ پہنچ پائے کہ اچانک اس کی نگاہ طفیل پر پڑ گئی۔
طفیل ایک اسٹور سے ہاتھ میں سامان اٹھائے تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اکبر نے فوراً وین ایک طرف رکوائی اور اندر بیٹھے اہلکار کو ہوشیار رہنے کا حکم دے کر تیزی سے طفیل کی طرف بڑھا۔ طفیل نے اکبر کو دیکھا تو خوفزدہ ہو کر چونکا۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
"کک...... کہیں نہیں۔" طفیل بولا۔
"اتنا سامان جمع کر لیا ہے۔ ارادے کیا ہیں۔ کہاں چھپ کر بیٹھے ہو؟" اکبر نے اس کا جائزہ لیا۔
"میں نے کہاں چھپنا ہے۔"
"جانتے ہو سکندر تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ اس نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ طفیل جہاں ملے اسے فوراً گولی مار دو۔" اکبر بولا۔
طفیل مزید ڈر گیا۔ "سکندر خواہ مخواہ میرا دشمن ہو گیا ہے۔ کچھ لے دے کے بات ختم کرا دو۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تم سمجھوتا کرنا چاہتے ہو؟" اکبر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔
"سمجھوتے کر کے ہی کام چلتے ہیں۔" طفیل نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔
"پھر ایسا کرتے ہیں۔ یہ سمجھوتا ہم آپس میں کر لیتے ہیں۔" اکبر نے دور دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟" طفیل نے سوالیہ نگاہوں سے اکبر کے چہرے کو دیکھا۔
"میرے ساتھ ہاتھ ملا لو۔ کر ایک کام کرتے ہیں۔ بات کھل جائے گی۔ پچیس فیصد تمہارا باقی میرا اور اس کے ساتھ سکندر سے تحفظ الگ۔" اکبر نے پیشکش کی تو طفیل کو کچھ حوصلہ ہو گیا۔
"کوئی ڈیل کرنا چاہتے ہو؟" طفیل نے وضاحت چاہی۔
"انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ سمجھو کہ تم نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سکندر میلوں دور ہو گیا۔"
"مجھے کرنا کیا ہے؟" طفیل نے پوچھا۔
"یاد ہے تمہارے پاس ایک تتلی اور دو سرے تھے۔" اکبر نے کہا۔
طفیل نے ایک لمحہ سوچ کر سر ہلایا۔ "ہاں۔"
"تتلی اور ایک سر فا بھاگ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مرغا میرے پاس اس وین میں بیٹھا ہے۔ اسے تم لے جاؤ اور کسی محفوظ جگہ چھپا لو۔ یہ سکندر کا مال ہے۔ اس سے ڈیل کر کے پیسہ کمائیں گے اور اس میں پچیس فیصد تمہارا حصہ ہوگا۔" اکبر نے بتایا۔
طفیل نے غیر محسوس طریقے سے وین کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟"
"دھوکا اب سکندر ہوگا۔"

"میں نے نیم بے ہوشی میں روا کا نام لیا تھا؟" خرم کے لئے یہ بات کسی حیرت سے کم نہیں تھی۔
"میں اس وقت اکیلا تمہارے پاس تھا۔ میں نے غور سے تمہیں روا کو پکارتے ہوئے سنا تھا۔ تمہاری پکار بہت دھیمی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ پکار سیدھی اس کے دل تک پہنچی ہوگی۔ کیونکہ چاہنے والے جب پکارتے ہیں تو پھر وہ پکار جھونکا بن کر اس تک پہنچ جاتی ہے۔"
خرم کا دل یہ بات سن کر جانے کیوں بے ترتیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں اسرار احمد کے چہرے سے ہٹا دیں۔ دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہوگئی۔
پھر اس خاموشی کو خرم نے ہی توڑا۔ "آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"
"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم روشن خان کے پاس ملازم تھے۔" اس انکشاف نے خرم کو مزید چونکا دیا۔ اس نے اپنی متوحش نگاہوں کو ایک بار پھر اسرار احمد کے چہرے پر مرکوز کر دیا اور سوچنے لگا کہ یہ روشن خان کا آدمی تو نہیں ہے؟
اسرار احمد اس کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا۔ "گھبراؤ نہیں میں روشن خان کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی سکندر کے ساتھ میرا دوستانہ تعلق ہے۔"
"آپ سکندر کو بھی جانتے ہیں؟" خرم بولا۔
"وہ کیا کرتے ہیں، میں سب جانتا ہوں۔" اسرار احمد کا چہرہ متانت اور کرب کی کیفیت میں ڈوب گیا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اسرار احمد نے آنے کی اجازت دی۔ وہی ملازم ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے آیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے ٹرے میز پر رکھی اور خرم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "کھانا لے آیا ہوں۔ آپ کہاں کھانا چاہیں گے۔"
"آپ جاؤ میں کھا لوں گا۔" خرم نے کہا۔ ملازم چلا گیا۔
"تم کھانا کھالو" اسرار احمد بولا۔
"میں کچھ اور سننا چاہتا ہوں ان لوگوں کے بارے میں اور یہ کہ آپ ان کو کیسے جانتے ہیں۔" خرم کی بھوک پر تجسس غالب آ گیا تھا۔
"باتیں طویل ہیں۔ تمہیں پہلے کھانا کھا لینا چاہئے۔"
"میں پہلے جاننا چاہتا ہوں۔"
"میں نے تمہیں ان کے پاس کئی بار دیکھا تھا۔ شاید تم نے بھی مجھے ان کے پاس دیکھا ہو"
"مجھے یاد آ رہا ہے۔ آپ ان کے بزنس پارٹنر تو نہیں تھے؟" یکدم خرم کو یاد آیا۔
"تم ٹھیک سمجھے۔"
"آپ نے ان کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار شروع کیا تھا۔" خرم کو کچھ اور بھی یاد آنے لگا۔
"روشن خان اور سکندر وہ زخم ہیں جو مسلسل رس رہے ہیں۔ مجھے اذیت ناک تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے انہوں نے۔" اسرار احمد کی آواز میں دکھ چھلکنے لگا اور آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔
خرم مبہوت اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ جاننے کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ تب اسرار احمد، ماضی کی بند کتاب کھولنے لگا۔

☆.........☆.........☆

اسرار احمد کی زندگی ایمانداری کی مثال تھی۔ وہ ایسا کاروباری آدمی تھا جس نے کبھی کسی کا حق رکھا تھا اور نہ ہی بے ایمانی کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ اس کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اچھی تعلیم کے لئے اس نے اپنے بچوں کو ملک سے باہر بھیج دیا تھا۔ جب ان کا دل چاہتا تھا وہ میاں بیوی اپنے بچوں سے ملنے چلے جاتے تھے۔
بیرون ملک میں بیٹیوں کے اچھے رشتے ملے تو انہوں نے ان کی شادیاں کر دیں اور اسرار احمد نے اپنے بچوں کو بیرون ملک میں کاروبار شروع کرا دیا۔
اسرار احمد کی بدقسمتی تھی کہ اس کی ملاقات گاڑی خریدنے کے دوران روشن خان سے ہوگئی۔ روشن خان نے اپنی باتوں سے اسرار احمد کو ایسا متاثر کیا کہ پہلی ہی ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ ایک دن سکندر سے بھی روشن خان نے اس کا تعارف کرا دیا۔
دوستی کچھ اور بڑھی تو روشن خان نے ایک کاروبار کی منصوبہ بندی اسرار احمد کے سامنے رکھی۔ اسرار احمد کی نظر میں روشن خان ایک اچھا انسان اور اصول پسند کاروباری شخص تھا۔ اسرار احمد کو اس کی کاروباری منصوبہ بندی پسند آئی اور وہ سرمایہ کاری کرنے کو راضی ہوگیا۔ اسرار احمد کو مزید اعتماد میں لینے کے لئے روشن خان اسے وہ فیکٹری بھی دکھانے لے گیا جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس فیکٹری کو خرید کر از سر نو شروع کریں گے۔
روشن خان نے فیکٹری باہر سے دکھائی تھی۔ انڈسٹریل ایریا میں طول و عرض میں پھیلی ہوئی وہ فیکٹری بند تھی۔ روشن خان نے بتایا تھا کہ اس فیکٹری کے مالکان ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کو بیچنا چاہتے ہیں۔ اسرار احمد خوش تھا کہ وہ آئندہ بڑے پیمانے پر اس ملک میں کاروبار جمالے گا۔ اور پھر روشن خان نے اپنی باتوں سے کچھ ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اسی کا ہو کے رہ گیا تھا۔
کاروبار میں شرائط و ضوابط طے کرنے کے بعد اسرار احمد نے شراکت داری کی شرط کے مطابق تین کروڑ روپے کا چیک انہیں دے دیا۔ روشن خان نے بھی اس سے اس کا پیسہ کھینچنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔
وہ روپیہ روشن خان کے اکاؤنٹ میں چلا گیا۔ ان ہی دنوں اسرار احمد کی بیوی نفیسہ کا تایا زاد بھائی مجاہد سلطان آ گیا۔ اس نے بتایا کہ جس فیکٹری کا کئی مہینوں سے اپنے شراکت دار کے ساتھ کیس چل رہا تھا، اس کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگیا ہے۔ اب وہ فیکٹری کو پھر سے شروع کرنا چاہتا ہے اور اسے سرمائے کی ضرورت ہے۔ بینک سے سود لینا نہیں چاہتا، اس لئے وہ آپ لوگوں کے پاس آیا ہے تاکہ اس میں سرمایہ کاری کر کے ایک ساتھ کاروبار کیا جائے۔
اسرار احمد نے پہلے سوچا کہ وہ اپنی شراکت داری کے بارے میں مجاہد کو بتا دے۔ لیکن فوری مجاہد کی امید توڑنے کی بجائے اسرار احمد نے پوچھا۔ "وہ فیکٹری کہاں ہے؟"
"چلیں چلتے ہیں۔ میں آپ کو فیکٹری دکھاتا ہوں۔" مجاہد اسی وقت کھڑا ہو گیا اور دونوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔
جب اسرار احمد اس کے ساتھ فیکٹری کے سامنے پہنچا اور مجاہد نے بتایا کہ یہ وہ فیکٹری ہے جس کا فیصلہ اس کے حق میں ہوا ہے تو اسرار احمد دم بخود رہ گیا۔ کیونکہ یہ وہی فیکٹری تھی جو روشن خان اسے دکھا چکا تھا۔
"یہ فیکٹری تمہاری ہے؟"
"جی۔ کل سے اس فیکٹری میں چوکیدار آ جائے گا اور فیکٹری کا گیٹ کھل جائے گا۔ ڈیڑھ سال تک میں نے کیس لڑا ہے۔ اب میں اس کا با اختیار مالک ہوں۔ ایک ایک کاغذ میرے پاس ہے۔ عدالت کا فیصلہ میرے پاس ہے۔" مجاہد نے بتایا۔
اسرار احمد تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے واپس چلنے کو کہا اور مجاہد سے کہا کہ وہ چند دن سوچنے کے بعد اس بارے میں بتائے گا۔ مجاہد چلا گیا۔
اسرار احمد بہت پریشان ہو گیا تھا۔ نفیسہ نے اسرار احمد کو پریشان دیکھا تو وجہ پوچھی۔ پہلے اسرار احمد بتانے کو تیار نہیں تھا۔ نفیسہ کے مجبور کرنے پر آخر اس نے سب بتا دیا۔ نفیسہ بھی پریشان ہوگئی۔
دوسرے دن اسرار احمد ناشتے کے بعد روشن خان کے پاس چلا گیا۔ روشن خان پر تپاک انداز میں ملا۔ اسرار احمد فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔
"روشن خان میں ایک بار پھر فیکٹری دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں؟" روشن خان بولا۔
"تم میرے ساتھ چلو۔ راستے میں باتیں کرتے ہیں۔" اسرار احمد نے کہا۔
روشن خان نے اسرار احمد کا چہرہ پڑھ لیا تھا کہ اسرار احمد کو شاید کچھ بھنک پڑ گئی ہے۔ "دو چار دن میں ہمیں قبضہ ملنے والا ہے، ایک ساتھ اسے اندر سے بھی دیکھ لیں گے۔"
"میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔" اسرار احمد بضد ہو گیا۔
روشن خان نے اسی وقت ڈرائیور سے کہہ کر پجیرو نکالی اور دونوں اس فیکٹری پر پہنچ گئے۔ اسرار احمد کے دل میں اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا کیونکہ یہ وہی فیکٹری تھی جس کا اصل مالک مجاہد تھا۔
"روشن خان، اس فیکٹری کا اصل مالک کون ہے؟" اسرار احمد نے پوچھا۔
"دو دن کے بعد اس فیکٹری کے ہم مالک ہونے والے ہیں۔" روشن خان نے کہا۔
"یہ فیکٹری بک ہی نہیں رہی تو ہم اس کے مالک کیسے بنیں گے؟" اسرار احمد بولا۔
"یہ کس نے کہہ دیا آپ سے؟"
"یہ مجھ سے اس فیکٹری کے اصل مالک نے کہا ہے۔" اسرار احمد کا لہجہ اونچا ہو گیا تھا۔
روشن خان نے اسرار احمد کی بات سن کر جواب دینے کی بجائے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ گاڑی اس جگہ سے لے جائے۔ ڈرائیور نے پجیرو کا رخ گھر کی طرف کر لیا۔
"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا روشن خان۔"
"بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" روشن خان نے اطمینان سے کہا۔
"مجھے میرا پیسہ واپس کر دو۔ میں سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہتا اور نہ تمہارے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔" اسرار احمد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
"تمہیں یہ معلومات دی کس نے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان باتوں کا تمہیں پتا کیسے چلا؟" روشن خان کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔ وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔
"میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا لیکن میرے سامنے حقیقت کھل گئی ہے۔ مجھے میرا روپیہ واپس کر دو۔" اسرار احمد بولا۔
"ڈرائیور رفتار بڑھا دو۔" روشن خان نے کہا اور پجیرو کی رفتار بڑھ گئی۔
اسرار احمد چیخا۔ "گاڑی روکو...... میں کہتا ہوں گاڑی روکو۔"
ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں بہرے ہو گئے ہوں۔ پجیرو کی رفتار غیر معمولی تھی اور روشن خان اطمینان سے بیٹھا تھا۔
"میں کہتا ہوں گاڑی روکو۔"
"پیسہ نہیں لینا کیا۔" روشن خان مسکرایا۔
اسرار احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس وقت وہ پاگل لگتا تھا۔ ایسا جنونی جس کی عقل سلب ہو چکی ہو۔
پجیرو سیدھی روشن خان کی ورکشاپ میں چلی گئی۔ روشن خان اطمینان سے باہر نکلا اور ایک طرف چل پڑا۔ چلتے ہوئے اس نے اپنے آدمیوں کو ایک مخصوص اشارہ کر دیا تھا۔ وہ آدمی اسرار احمد کو کھینچ کر ورکشاپ کے پیچھے لے گئے۔ اس دوران روشن خان کسی کو فون کرتا رہا۔ اسرار احمد کی مزاحمت کسی کام نہ آئی اور اسے ورکشاپ کے اس حصے میں پہنچا دیا جہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔
"اپنی بیوی کو فون لگاؤ اور اسے بولو کہ وہ کاغذات جس پر ہمارا معاہدہ تحریر ہے، وہ لے کر اس آدمی کے ساتھ آ جائے۔" روشن خان نے کہا۔
"میں اپنی بیوی کو ہرگز فون نہیں کروں گا۔" اسرار احمد دوٹوک بولا۔
"اس کا مطلب ہے کہ تم اس طرح نہیں مانو گے۔" روشن خان یہ کہہ کر ٹہلنے لگا جبکہ اسرار احمد اسے دیکھتا رہا۔
اسی وقت سکندر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا ہوا۔ کیوں بلایا ہے مجھے؟"
"یہ میرا بزنس پارٹنر ہے۔ ہم نے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی کاپی میں نے اس کا اعتماد مزید مضبوط کرنے کے لئے اسے دے دی تھی۔ اب یہ میرے ساتھ بزنس کرنا نہیں چاہتا اور میں کہہ رہا ہوں کہ وہ کاپی مجھے واپس کر دو تو یہ کاپی واپس نہیں کر رہا۔" روشن خان نے بتایا۔
"تم کاپی کیوں واپس نہیں کر رہے ہو؟" سکندر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"اس نے میرے ساتھ فراڈ کیا ہے، دھوکا کیا ہے۔" اسرار احمد چیخا۔
"سکندر...... یہ ایسے ہی بولتا رہے گا۔ میں اس کے گھر اپنا آدمی بھیج چکا ہوں۔ وہ اس کے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ اسے کہو کہ یہ اپنی بیوی سے فون پر بات کرے اور کاپی لے کر آ جائے یا میرے آدمی کو وہ کاپی دے دے۔" روشن خان بولا۔
سکندر نے ایک پل میں پستول نکالا اور اسرار احمد کے ماتھے پر اس کی نال ٹکا دی۔ اسرار احمد گھبرا گیا۔
"فون کرتے ہو کہ گولی چلا دوں۔" سکندر کا لہجہ وحشت ناک تھا۔
اسرار احمد پھنس گیا تھا۔ اس نے فون نکالا اور نفیسہ کو فون کر کے ہدایت کی کہ وہ فلاں دراز سے کاپی نکال کر باہر آدمی کھڑا ہے اسے دے دے۔
نفیسہ نے اسرار احمد کی گھبرائی ہوئی آواز سنی تو وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے معاہدے کی کاپی نکالی اور جونہی وہ باہر کھڑے آدمی کو دینے گئی تو اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ آدمی اسے لے کر اس جگہ پہنچ گیا۔
"تم کیوں آئی ہو؟" اسرار احمد اسے دیکھتے ہی بولا۔
"میں ڈر گئی تھی۔ کیا ہو رہا ہے یہ۔" نفیسہ نے سب کی طرف دیکھا۔
"یہ کاپی انہیں دے دو۔" اسرار احمد نے کہا۔
"کیا انہوں نے ہمارا پیسہ واپس کر دیا ہے؟" نفیسہ نے پوچھا۔
"نہیں۔" اسرار احمد نے نفی میں گردن ہلائی۔
"پھر ہم یہ معاہدہ کیوں واپس کریں۔ پہلے یہ ہمارا پیسہ دیں۔" نفیسہ ڈٹ گئی۔
"اور نہ دیں تو......" سکندر نے پوچھا۔
"میں یہ کاپی نہیں دوں گی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی جو میں آپ کی بات سنتے ہی کاپی لے آئی۔ مجھے پولیس کے پاس جانا چاہئے تھا۔"
"پولیس تمہارے سامنے کھڑی ہے۔" سکندر مسکرایا۔
"اپنے اختیار سے انتقام آگے بڑھ کر قدرت کو اپنا اختیار استعمال کرنا پڑ جائے۔" نفیسہ نے اس کی مکار مسکراہٹ دیکھتے ہوئے کہا۔
سکندر اس وقت فرعون بنا ہوا تھا۔ برداشت اس کے اندر جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اس نے پستول کی نال اس کی طرف کی اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔ اسرار احمد چیخا۔
سکندر نے نفرت سے کہا۔ "مجھے نصیحت کرتی ہے۔"
نفیسہ خون میں لت پت نیچے گر گئی۔ اس کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ اسرار احمد چلاتا رہا۔ ان دونوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ روشن خان نے وہ معاہدہ اٹھایا اور سکندر کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔
شام ہو چکی تھی۔ روشن خان کے آدمیوں نے نفیسہ کی لاش اٹھائی اور اسرار احمد کو ساتھ لیا اور ان کے گھر کے قریب والی سڑک پر اس کی لاش رکھ دی۔ سکندر کے ساتھ پولیس آ گئی۔
سکندر نے جو رپورٹ بنائی۔ وہ یہ تھی کہ دونوں میاں بیوی چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک ڈاکو آ گیا۔ اس نے ان کو لوٹنا چاہا، اسرار احمد نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں اس نے گولیاں چلا دیں۔ (جاری ہے)

محمد فاروق انجم

آخری قسط

[illegible]

دونوں کے منہ حد سے زیادہ کھل گئے ہیں اور تم اور سکندر مل کر میری بیٹی پر بھی ڈورے ڈال رہے ہو۔ اب میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ کئی مہینوں سے میں تم دونوں کے ساتھ سائے کی طرح تھا۔ مجھے تمہارا آدمی خرم مل گیا اور میں نے تم دونوں کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا اور انہیں ایسی کہانی سنائی کہ خرم کو میری کہانی پر یقین کرنا ہی پڑا۔"

"چلیں جو ہوا اسے اب ختم کرتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"آپ کھل کر کام کریں۔ ہم آپ سے ایک پائی نہیں لیں گے۔ سکندر کو سمجھانا میری ذمہ داری۔ ہماری جان بخش دیں۔" روشن خان بولا۔

"سکندر بہت ضدی ہے۔ مجھے بہت نقصان پہنچا چکا ہے۔" اسرار احمد نے کہا۔

"اس کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

"اور تمہاری گارنٹی کون دے گا؟"

"میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دوں گا۔" روشن خان نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

"تم دونوں شہر کو اپنی مٹھی میں سمجھتے ہو۔"

"خان صاحب، ہماری جان بخش دیں، آپ کو ہماری شکل بھی نظر نہیں آئے گی۔" روشن خان نے ایک بار پھر استدعا کی۔

اسرار احمد کے چہرے پر نرمی آ گئی۔ "یقین کرو میں تم دونوں سے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ تم دونوں کو مار کر ہی دم لینے والا تھا۔ میری بیٹی کے جو تم پیچھے پڑے ہوئے ہو اس کا کیا ہوگا؟"

"ہم آپ کے ہر معاملے سے دور ہو جائیں گے۔" سکندر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اسرار احمد اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر دھوکا ہوا تو؟" اسرار احمد نے پوچھا۔

"بالکل نہیں ہوگا۔ آپ میرا یقین کریں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سکندر کو جو میں کہوں گا، وہ مان جائے گا۔"

"اور اب ان کا کیا کروں؟" اسرار احمد کا اشارہ ان تینوں کی طرف تھا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ انہیں مار کر اسی جگہ دفن کر دوں گا۔" روشن خان بولا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں۔ اٹھو اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔" اسرار احمد نے کہا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے اور ناصر الٹے پیر بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے واپس اسی جگہ سے نیچے کود گیا۔

نیچے جاتے ہی اس نے خرم اور ردا کو ایک طرف کیا اور ساری باتیں ان کے گوش گزار کر دیں۔ خرم سن کر بولا۔ "تو یہ معاملہ ہے؟"

"میں کہتی ہوں کہ موقع ہے یہاں سے نکل جاتے ہیں۔" ردا نے جلدی سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، اب یہ اسی جگہ دفن ہوں گے ورنہ ہم نکلیں گے ورنہ یہ ہمیں جینے نہیں دیں گے۔ گولڈن خان کے بارے میں پچھلے دنوں ایک بڑے پولیس افسر نے ایک پریس کانفرنس کی تھی کہ وہ اس شخص کی تلاش میں ہیں اور یہ ایک عام انسان کے روپ میں مزے سے گھوم رہا ہے۔" خرم بولا۔

اسی اثنا میں بیل ہوئی۔ خرم نے ناصر اور ردا کو ایک طرف چھپا دیا اور خود اندر جا کر بولا۔ "باہر کوئی آیا ہے۔"

"سکندر ہوگا، اسے اندر لے آؤ۔" اسرار احمد نے کہا۔ اس کے برابر روشن خان بیٹھا ہوا تھا۔

خرم باہر نکلا اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ سکندر تیزی سے اندر داخل ہوا تو خرم نے سامنے آ کر اسے روک لیا۔

"اوہ! تو تم ہو؟" سکندر نے اسے دیکھتے ہی اپنا ریوالور نکال لیا۔

"گولی چلانے سے پہلے میری بات غور سے سن لو۔" خرم نے جلدی سے کہا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" سکندر بولا۔

"دیکھو میں جان بچا کر یہاں چھپا ہوا ہوں، اندر خونی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔" خرم نے کہا۔

"اندر کون ہے؟" سکندر نے ایک نظر مین دروازے کی جانب دیکھا۔

"اندر گولڈن خان اور روشن خان بیٹھے ہیں، وہ تمہیں مارنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔" خرم نے بتایا۔

"تم میرے ہمدرد کیوں بن رہے ہو؟" سکندر نے پوچھا۔

"کیونکہ انہوں نے ردا کو مار دیا ہے۔" خرم نے رو دینے کی اداکاری کی۔

"کیا؟" سکندر چونکا۔

"اور اب آپ کو مارنا چاہتے ہیں۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، بھلے آپ مجھے گولی مار دیں لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں۔" خرم نے معصوم سی صورت بنالی۔

سکندر نے سوچا کہ روشن خان نے اسے اس جگہ اچانک یوں ہی نہیں بلایا، اس کے پیچھے اس کا کوئی مقصد ہوگا کیونکہ دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ چار پانچ دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہیں گے اور پھر اس جانب پیش قدمی کریں گے لیکن روشن خان نے اسے پہلے ہی یہاں بلا لیا ہے، یقیناً خرم سچ کہہ رہا ہے۔ سکندر بھی غصے کا تیز جذباتی آدمی تھا۔ وہ ریوالور ہاتھ میں لئے مین دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے دونوں کو براجمان پایا۔ ایک لمحے میں سکندر کو خرم کی بات میں سچائی نظر آئی اور پھر اسرار احمد کے ہاتھ میں ریوالور ابھی تک موجود تھا۔

"آؤ سکندر، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" اسرار احمد کا کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر ریوالور والا ہاتھ اٹھ گیا۔

خرم چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول سے ہوائی فائر کر دیا۔ سکندر سمجھا کہ اسرار احمد نے فائر کھول دیا ہے۔ وہ جھکا اور اس نے یکے بعد دیگرے گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ اسرار احمد اور روشن خان کو ایک ساتھ کئی گولیاں لگیں اور وہ خون میں لت پت ساکت ہو گئے۔

خرم نے ناصر کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ جب سکندر کے ریوالور میں گولیاں ختم ہو گئیں اور وہ اپنا کام کر چکا تو خرم نے اشارہ کیا۔ ناصر نے سکندر پر جست لگا دی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ خرم نے آگے بڑھ کر پستول کے بٹ سکندر کے سر پر مارے اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ پھر انہوں نے سکندر کو قابو کیا اور اسے اچھی طرح سے باندھ دیا۔

"تم جیسے لوگ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنی من مانیاں کرتے ہیں اور فرعون بن کر ہم جیسے ناچاروں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں اور یہ کبھی نہیں سوچتے کہ قدرت کی عدالت بھی موجود ہے۔"

"کھولو مجھے۔" سکندر چیخا۔

"اب دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

خرم نے سکندر کا موبائل فون لیا اور پولیس کو فون ملا کے لہجہ بدل کر اطلاع دی کہ اس نے اس فارم ہاؤس میں گولیاں چلنے اور مشکوک لوگوں کو دیکھا ہے۔ پھر فون ایک طرف رکھ کر خرم نے ایک گولی سکندر کی ٹانگ میں ماری اور سکندر کی چیخ کے بیچ میں بولا۔ "چلو نکلو یہاں سے۔"

وہ تینوں اس فارم ہاؤس سے نکل کر ایک طرف دوڑ گئے۔

☆......☆......☆

خرم، ناصر اور ردا نے عینی اور نادیہ کو بھی گیسٹ ہاؤس سے برآمد کر لیا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ دوسرے دن کے اخبار میں گولڈن خان اور روشن خان کی لاش کے ساتھ سکندر کے مرنے کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ سکندر بہت زیادہ خون بہہ جانے سے چل بسا تھا۔

ردا ایک بار پھر اپنے اس گھر میں گئی جو اس کے باپ کی آخری نشانی تھا۔ ردا کے ساتھ خرم بھی تھا۔ گھر دیکھنے کے بعد خرم نے کہا۔ "اس گھر کو پھر سے آباد کر دو ردا۔ یہ گھر بہت پُرسکون ہے۔"

"میں خود اس گھر کو آباد کرنا چاہتی ہوں۔ تم اس گھر کو آباد کرنے میں میری مدد کرو گے؟" ردا نے پوچھا۔

"اگر تم کہو گی تو ضرور کروں گا۔"

"اور تم کیا کہتے ہو؟" ردا نے پوچھا۔

[illegible]

(ختم شد)

www.iqbalkalmati.blogspot.com
مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں